میر ظہیر عباس روستمانی
03072128068
پاکستان ایٹمی طاقت کیسے بنا
یادداشت مدہم پڑنے سے پہلے
خودنوشت
سفیرِ پاکستان میاں عبدالوحید

پاکستان ایٹمی طاقت کیسے بنا

یادداشت مدہم پڑنے سے پہلے

خودنوشت

سفیر پاکستان میاں عبدالوحید

جمہوری پبلیکیشنز

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ پاکستان ایٹمی طاقت کیسے بنا۔ یادداشت مدہم پڑنے سے پہلے
• مصنف۔ میاں عبدالوحید • اشاعت۔ اپریل 2013ء
• سرورق۔ مصباح سرفراز • ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-9739-49-1

قیمت 580 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرون پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Pakistan Atimy Taqat Kaise Bana.Yadasht Madham Parney se Pehley

JUMHOORI PUBLICATIONS

2Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan.
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

انتساب

نگہت، بینا، ظافر اور نکول کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

DR. A. Q. KHAN
NI & BAR, HI

"Mountain View"
207, Hillside Road,
E-7, Islamabad
Pakistan
Date 11.1.2013

FOREWORD

Mian Abdul Waheed was a career diplomat for 25 years. He is first cousin of the late Gen. Zia-ul-Haq and Mrs. S. Zia-ul-Haq. He entered the foreign service through a competitive examination long before Gen. Zia appeared on the scene of Pakistani politics.

Mian Abdul Waheed was known as a very able and competent diplomat. While serving in Germany and Italy he rendered invaluable services to Pakistan's nuclear programmes which were being run separately by Mr. Munir Ahmad Khan, Chairman of the Pakistan Atomic Energy Commission and by me as Head of the Engineering Research Laboratories, later renamed by Gen. Zia as the Dr. A.Q. Khan Research Laboratories, Kahuta. The nuclear weapons programme of which I was Head was extremely sensitive and of national importance. Mian Waheed, as a diplomat at Bonn and Rome, helped us acquire important and invaluable items for our programme, and that without violating any local export regulations. My Procurement Officer, Mr. Ikramul Haq Khan, received prompt and efficient support and guidance from him.

I have had the pleasure of meeting Mian Abdul Waheed numerous times over the years. He is very knowledgeable with many contacts with important officials in the countries where he served. His simple and polite approach made him a highly successful diplomat and Pakistan is indebted to him for invaluable services rendered. I am personally grateful to him for helping us in our weapons programme.

I wish Mian Abdul Waheed all the best in his future endeavours.

Dr. A.Q. Khan
NI & Bar, HI,
Former Chairman
Uranium Enrichment Plant, Kahuta
and
Advisor to the Prime Minister

"ماؤنٹین ویو"
207 ہل سائیڈ روڈ،
ای 7، اسلام آباد، پاکستان۔
11 جنوری، 2013ء

پیش لفظ

میاں عبدالوحید 25 سال تک سفارت کار رہے۔ وہ جنرل ضیاالحق مرحوم اور بیگم ضیاالحق کے فرسٹ کزن ہیں۔ جنرل ضیا کے پاکستانی سیاست میں ظاہر ہونے سے بہت عرصہ قبل ہی میاں عبدالوحید فارن سروس کا حصہ بن چکے تھے۔

میاں عبدالوحید ایک معروف اور قابل ڈپلومیٹ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ جرمنی اور اٹلی میں اپنی پیشہ وارانہ خدمات دیتے ہوئے انہوں نے پاکستان کے نیوکلیئر پروگرامز کے لیے قابل قدر خدمات پیش کیں جنہیں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین جناب منیر احمد خان اور انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز کے سربراہ کی حیثیت سے میں چلا رہے تھے۔ انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز کو بعدازاں جنرل ضیا نے ڈاکٹر اے کیو خان ریسرچ لیبارٹریز کہوٹہ کا نام دے دیا۔ ایٹمی ہتھیاروں کے پروگرام کا سربراہ میں تھا، جو کہ انتہائی حساس اور قومی اہمیت کا حامل پروگرام تھا۔ بون اور روم میں ڈپلومیٹ کی حیثیت سے میاں وحید نے ہمارے لیے اہم اور قابل قدر سامان کی خرید میں مدد کی اور یہ سب کسی مقامی برآمداتی قوانین کی خلاف ورزی کے بغیر کیا۔ ہمارے ایسی خریداری یا پروکیورمنٹ کے افسر جناب اکرام الحق خان کو ان کی جانب سے ہمیشہ مستند اور فوری مدد اور رہنمائی ملتی رہی۔

گزشتہ برسوں میں مجھے میاں عبدالوحید سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ انتہائی

باخبر شخصیت ہیں جن کے اُن ممالک میں جہاں وہ خدمات انجام دیتے رہے، اہم افسران سے روابط رہے ہیں۔ اُن کے سادہ اور دوستانہ رویے نے انہیں انتہائی کامیاب ڈپلومیٹ بنایا اور پاکستان کے لیے ان کی قابل قدر خدمات کے باعث ہم ان کے احسان مند ہیں۔ میں ذاتی طور پر ہمارے ایٹمی ہتھیاروں کے پروگرام میں ان کی مدد کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

میں میاں عبدالوحید کے مستقبل کے منصوبوں اور عزائم کے حوالے سے اُن کے لیے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر اے کیو خان
سابق چیئرمین
یورینئم افزودگی پلانٹ، کہوٹہ
مشیر برائے وزیراعظم

نذرانۂ عقیدت

میری اہلیہ نکہت اور بچے بینا اور ظافر زندگی کے نشیب و فراز میں شانہ بشانہ میرے ساتھ رہے۔ اہلیہ نے خواتین اور عام عوام کے لیے متعدد تھیٹر شوز کا اہتمام کیا جن میں اٹلی کے شہر روم اور جرمنی کے شہر ڈسلڈ ورف میں منعقد پروگرام انتہائی اہم تھے۔ اوّل الذکر شہر کا فنکشن اوپرا ہاؤس میں منعقد ہوا جس میں نہ صرف لوگوں کی کثیر تعداد موجود تھی بلکہ اسے انتہائی سراہا بھی گیا۔ ڈسلڈ ورف میں بھی شو کا انعقاد اوپرا ہاؤس میں ہوا اور اس نے بھی خوب داد سمیٹی۔ اس وقت کے صدر پاکستان ضیاالحق نے روم کے شو میں شرکت کی اجازت دیتے ہوئے مجھ سے کہا، "Do in Rome, as the Romans do."

بینا اور ظافر نے کم سنی کے باوجود شوز میں انتہائی عمدہ اداکاری کی۔

میری اہلیہ نے سفارت خانہ کے ممبران کی بیویوں کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ضرورت مند خواتین کی بھی مدد کی۔ ان کی امداد کا دائرہ صرف افسران کی بیویوں تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے کم آمدن سٹاف ممبران کا بھی خصوصی خیال رکھا۔ انہوں نے روم اور بون میں سفارت خانہ کے احاطہ میں پاکستانی بچوں کے لیے سکول کا انتظام بھی کیا۔

سفارتی کیریئر میں میرے پہلے سفیر ایم ایوب نے نہ صرف شفقت برتی بلکہ دفتری امور پر میری دسترس بھی انہی کی مرہون منت ہے۔ سفیر عبدالرحمان خان سے مجھے سفارتی کارکردگی کو بہتر بنانے کا سبق ملا جو ملازمت کے تمام سالوں میں میرا اثاثہ رہا ہے۔ دونوں سفیروں نے مجھے بہترین ڈیسک اور فیلڈ افسر کا درجہ دیا۔ تنزانیہ میں ہائی کمشنر مرزا رشید احمد مجھے چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ اگرچہ میرے پاس ذاتی رہائش موجود تھی مگر اس ملک میں تمام عرصہ رشید صاحب اور ان کے خاندان کے ساتھ بیتا۔

رنگون میں مجھے گالف کھیلنے کا شوق پیدا ہوا تو برما کی نوجوان خواتین سے تربیت ملی۔ روم میں اعلیٰ پائے کے دو گالف کوچز میں سے ایک مانکا (Manca) نے مجھے کھیل کے پیشہ ورانہ آداب سکھائے۔ ان سے سیکھنے کے بعد مجھے کسی اور کے زیر تربیت نہیں رہنا پڑا۔ جن دیگر شخصیات کے ساتھ مجھے گالف کھیلنے کا موقع ملا ان میں اطالوی قومی چیمپئن انجینئر Guliarelli، اطالوی خواتین چیمپئن (MARIA CROCE)، بون گالف کورس کے رچرڈ، سٹٹگارٹ کی میئر (Dr. GEISLA Meister)، (Dr.GISELA SCHILL)، پیٹر ورہن (PETER WERHAN)، جویا مارزوکی (JOYA MARZOCCI)، انجلیکا (ANGELIKA) اور حسن موسیٰ شامل ہیں۔ اسلام آباد گالف کلب کے سعید احمد اور اظہر حسین شاہ بخاری نے نہ صرف گالف سے لطف اندوز ہونے میں مدد کی اور دنیاوی معاملات میں بھی میری حوصلہ افزائی کی۔

مجھے جب بھی پاکستان آنے کا موقع ملا تو صدر ضیاالحق کے ساتھ گالف کھیلتا جو گالف انتہائی عمدگی سے کھیلتے تھے۔ جس دن انہوں نے وزیراعظم جونیجو کو عہدہ سے ہٹایا، اس روز بھی ہم نے راولپنڈی گالف کلب میں سات ہولز کی گالف کھیلی۔ ضیاالحق بہت تعاون کرتے تھے۔ جب بھی میں غلط کھیلتا وہ مجھے دوبارہ کھیلنے کا کہتے۔ میں کہا کرتا تھا کہ صدر مملکت کے ساتھ کھیلنا آسان نہیں۔ ضیاالحق نے دبئی میں پہلے گالف کورس کا بھی افتتاح کیا تھا۔

بشریٰ تسکین سے بھی میری ملاقات اسلام آباد گالف کورس میں ہوئی تھی اور پھر

ہم ساتھی کھلاڑی بن گئے۔ بشریٰ کھیل کو خوب سمجھتی ہیں اور میں ان کا مستقبل روشن دیکھتا ہوں۔ وہ اسلام آباد گالف کلب کے لیے اثاثہ ثابت ہوں گی۔ انہوں نے بھی مجھ سے خوب تعاون کیا۔ میری نیک تمنائیں تمام عمر اُن کے ساتھ ہیں۔

میں اپنے بیٹے ظافر کی منگیتر نکول (ندا) بارایٹ لاء کا انتہائی مشکور ہوں کہ اس نے اس کتاب کے انگریزی مسودے پر نظر ثانی کرنے اور اس کی اغلاط درست کرنے پر اپنا وقت صرف کیا۔

میں لیگل خدمات کے لیے اپنے ایڈووکیٹ رمضان چوہدری صاحب اور طارق شفیق بھندارا، اور پچھلے سولہ برسوں سے مسلسل سیاسی حمایت کے لیے گل نواز خان کا بھی مشکور ہوں۔ میں عاطف علی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جس نے اس کتاب کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے دو سال تک اَن تھک کام کیا۔

میں جمہوری پبلیکیشنز کے چیف ایگزیکٹو جناب فرخ سہیل گوئندی کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ میرے ساتھ کام کیا اور اس کتاب کی بہتری کے لیے میری رہنمائی کی۔

پاکستانی قوم محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی بے حد احسان مند ہے کہ انہوں نے پاکستان کو بھارتی جارحیت اور غلبہ کے خطرے سے محفوظ بنایا۔ اُن کی محنت اور لگن کے باعث ہی پاکستان اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی طاقت بننے میں کامیاب ہوا۔ میں یہاں اُن کا بھی بے حد شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات اور وقت کی شدید قلت کے باوجود میری کتاب پر نظر ثانی کی، اس میں قابل قدر اضافہ کیا اور اس کا پیش لفظ تحریر فرمایا۔

میاں عبدالوحید

23 مارچ 2013ء

پہلا باب

سفارتی کیریئر کا آغاز

سفارتی کیریئر کا آغاز حادثاتی اور میری خواہش کے برعکس تھا۔ ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں سول سروس کا حصہ بنوں۔ سروس کو تبدیل کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ لیکن سفارتی خدمات کا باقاعدہ آغاز کرتے ہی میں ہر لمحے سے محظوظ ہوا۔ آج میں سفارتی خدمات کے 27 برسوں کو یاد کرتا ہوں تو اطمینان اور فخر محسوس ہوتا ہے کہ میری ادنیٰ خدمات میرے وطن کے کام آئیں۔

ایک تعبیر (DEFINATION) کے مطابق سفارتکار کو اپنے ملک کے لیے باہر رہنا پڑتا ہے۔ یہ لفظ ''رہنا'' ذومعانی ہے جس کا مطلب بیرون ملک رہتے ہوئے مادرِ وطن کی بہتری اور اس مقصد کے لیے وہ کہنا بھی ہے جس کا حقیقت سے تعلق نہیں۔ ایک انتہائی معزز سفیر نے مجھے بتایا کہ سفارتی سروس میں جیب خالی کرنے اور تھکانے کی حد تک محنت کے بعد ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ان کے کہنے کا مطلب تھا کہ سفارتکاروں کے پاس بیرون ممالک میں اختیار نہیں ہوتا اور وہ کامیابی صرف بھاگ دوڑ اور میزبان ملک میں اہم شخصیات سے تعلقات استوار کر کے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بالکل درست تھا اور میں نے اس سے بھرپور فائدہ بھی اٹھایا۔

ایک عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ دیگر ممالک کے سفارتکار پاکستانی

سفارتکاروں کی نسبت بہتر کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستانی سفارتکاروں کی کارکردگی ہر طرح سے بہترین اور کسی دوسرے ملک کے سفارتکار سے کم نہیں رہی۔ پاکستانی سفارت کاروں کو درپیش معاشی و افرادی قوت کے مسائل کے باوجود انہوں نے ہمیشہ بہترین کردار ادا کیا۔ وہ انتھک محنت کرتے تھے اور اگر کوئی وزارتِ خارجہ دفتر کا جائزہ لے تو اسے حیرت ہوگی کہ پورا عملہ دن رات مصروف عمل رہتا ہے۔ بیرون ممالک بھی پاکستانی مشن ایسے ہی کام کرتا ہے۔

بعض اوقات مشن کے خلاف شکایات حقیقی ہوسکتی ہیں مگر عموماً وہ بے بنیاد اور من گھڑت ہوتی ہیں۔

پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے بنیادی مقاصد یہ ہیں:

1) پاکستان کے تحفظ اور سالمیت کو یقینی بنانا۔

2) پاکستانی معیشت میں تجارت، سرمایہ کاری اور بیرونی امداد کے ذریعے بہتری لانے کے عمل میں مدد دینا۔

3) اسلامی ممالک کے ساتھ اتحاد کو قائم ودائم رکھنا۔

4) نوآبادیوں کے مقیموں کو اس نظام سے آزاد کرانا۔

پاکستان کی سفارت کاری ان مقاصد کے حصول میں خاصی حد تک کامیاب رہی ہے۔

سفارتی مشن چاہے ترقی پذیر ممالک یا پھر لندن جیسے کاسموپولیٹن شہر میں ہی کیوں نہ ہوں، ان کا دارومدار مشن کے سربراہ یعنی سفیر یا ہائی کمشنر پر ہوتا ہے۔ مشن کے سربراہ کا رویہ عمدہ اور ناقص کارکردگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے ماتحت کو خاندان کا فرد یا پھر معمولی ملازم سمجھ سکتا ہے۔ میں نے یہاں ''معمولی ملازم'' اس لیے لکھا کہ ہمارا ایک سفیر ماتحت عملہ سے اسی طرح کا سلوک کرتا اور بار ہا کہتا تھا کہ وہ آقا اور دیگر رعایا ہیں۔ افسران کی اے سی آر (کارکردگی رپورٹ) سربراہِ مشن کے مرہون منت ہوتی ہیں۔ اسی کے نتیجہ میں سفارتی محکمہ کے متعدد افسران 75 فیصد سے زائد نمبر

دوسرا باب

سفارت کاری کا فن سیکھنا

اکتوبر 1960ء میں محکمہ خارجہ جوائن کرنے کے بعد میں اور افضال قادر پی آئی اے کے ذریعے لندن اور وہاں سے ٹی ڈبلیو اے کے ذریعے بوسٹن پہنچے۔ ولسن ہاؤس جہاں ہم دوران تربیت ٹھہرے کے پری فیکٹ، روئے لوخیر (ROY LOCKHEIMER) نے ہمیں ایئرپورٹ سے وہاں پہنچایا۔ ہم فلیچر پہنچے تو وہاں میری نامی طالبہ سرخ HOT PENT پہنے اور ہاتھوں میں کافی تھامے لاؤنج کے صوفہ پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ مجھے اور افضال کو دیکھتے ہی میری اٹھی اور ہمیں کافی بنا کر دی۔ ولسن ہاؤس دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک طلباء اور دوسرا طالبات کے لیے۔ ماحول بہت دوستانہ تھا۔ ولسن ہاؤس میں عمدہ و لذیز بھرپور ناشتہ صبح 7 بجے ملتا، دوپہر کا کھانا قریباً 12 بجے اور ڈنر رات 6 بجے ملتا۔ اس کے بعد طلبا لائبریریوں، اپنے کمروں اور اکثر لاؤنج کا رخ کرتے جو نہ صرف تعلیم بلکہ میل جول کے لیے بھی استعمال ہوتا۔ چوں کہ ڈنر بہت جلد مل جاتا تھا، لہٰذا طلبا کو اکثر 9 بجے کے قریب بھوک لگ جاتی۔ پھر ہمیں دبلے بازو والی خواتین کی مدد سے فریج کھول کر باقی ماندہ کھانا چوری کرنا پڑتا۔

فلیچر سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی (ہارورڈ، ایم آئی ٹی اور ٹفٹس یونیورسٹیوں سے الحاق شدہ) سے انٹرنیشنل لاء اینڈ ڈپلومیسی میں ماسٹرز ڈگری حاصل کیے بغیر سفارتی

خدمات کا آغاز ممکن نہ تھا۔ اس ڈگری کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ کسی بھی مضمون میں B سے کم گریڈ پر ڈگری نہیں ملتی تھی۔ جن مضامین کا انتخاب میں نے کیا ان میں انٹرنیشنل لاء، ڈپلومیٹک تھیوری اینڈ پریکٹس، انٹرنیشنل اکنامکس، اکنامک ڈویلپمنٹ، کمپیریٹو اکنامک سسٹمز، ڈپلومیٹک ہسٹری آف یو ایس اے اور ڈپلومیٹک ہسٹری آف سوویت یونین شامل تھے۔ انٹرویو پر مبنی آخری امتحان پانچ پروفیسر صاحبان پر مشتمل بورڈ نے لینا تھا۔ اگرچہ پڑھائی مشکل مگر ماحول دوستانہ اور خوشگوار تھا۔ تمام اساتذہ امریکہ میں اپنے مضامین کے ماہرین کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان میں سے چند ایم آئی ٹی، Yale اور پرنسٹن سے وابستہ تھے۔ امریکی و پاکستانی اساتذہ کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پاکستان میں ایم اے اکنامکس کی جماعت میں شعبہ معاشیات کے سربراہ ڈاکٹر ایس ایم اختر نے دو مواقع پر میرے سوال کا جواب نہ دے سکنے کی صورت میں مجھے کلاس سے نکال دیا تھا۔ فلیچر میں آپ کیسا بھی سوال پوچھ لیتے، استاد پوری تندہی سے اس کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کرتا۔ اکثر اساتذہ انتہائی اہم کتابوں کے مصنف تھے جو نہ صرف فلیچر بلکہ دیگر یونیورسٹیوں میں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ ایک اور دلچسپ بات تھی کہ اگر کوئی ان کی کتابوں میں موجود تھیسس کو چیلنج کرتا تو وہ اسے تحمل سے سنتے اور پھر جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔

امریکی سفارتی تاریخ کے تین نمایاں اساتذہ میں سے ایک پروفیسر روہل بیٹلیٹ (ROHL.J.BARTLET) تھے۔ انہوں نے اپنی ایک کتاب میں جرمنی کو پہلی جنگ عظیم کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ جیسے ہی انہوں نے اس موضوع پر لیکچر کا آغاز کیا تو میں نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ صرف جرمنی ہی نہیں بلکہ انگلینڈ، فرانس اور روس بھی پہلی جنگ عظیم کے برابر ذمہ داران تھے۔ پھیلتی ہوئی جرمن بحریہ، برلن بغداد ریلوے اور نوآبادیوں کی تلاش نے جرمنی اور دیگر یورپی طاقتوں کے مابین چپقلش پیدا کی۔ سراجیو میں آسٹریا کے ولی عہد فرانسس فرڈیننڈ کے قتل سے بھڑکنے والی آگ نے بعد ازاں پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جرمن آبدوز کے حملہ میں ڈوبنے والے ایک بحری

جہاز لوزیٹانیا کو وجہ بنا کر امریکہ نے اتحادیوں کا ساتھ دیا اور جنگ میں کود گیا۔ اس سے پیشتر جرمن کونسل نے نیویارک میں انتباہی نوٹس کے ذریعے امریکی شہریوں کو آگاہ کیا تھا کہ وہ دشمن کے بحری جہاز میں سفر نہ کریں۔ مزید براں، لوزیٹانیا جہاز میں اسلحہ موجود تھا اور یہ اپنے بتائے راستے سے بھی ہٹ کر محو سفر تھا۔ امریکہ کے پاس جنگ میں شمولیت کا کوئی واضح جواز نہ تھا۔ طویل بحث و مباحثہ کے بعد پروفیسر بٹلیٹ (BARTLET) نے کہا، ''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' انہوں نے مزید کہا، ''یہ اینگلو سیکسن سے ہمدردی ہی تھی جس کے باعث امریکہ نے پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کا ساتھ دیا۔''

جیسا کہ اب پاکستان میں رواج ہے، فلیچر میں بھی طالبات زیادہ محنتی اور اچھے نتائج مرتب کر رہی تھیں۔ وہ متعدد کتب پڑھتیں اور نوٹس بنا لیتیں۔ سُو کلنگمین (SUE KLINGMANN) ایک عمدہ شخصیت کی مالک اور اچھی دوست تھی۔ اس نے مجھے اپنے نوٹس پڑھنے کا موقع دیا جس نے امتحانات میں اچھا نتیجہ حاصل کرنے میں خاصی مدد کی۔ بعد ازاں وہ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں تعینات ہوگئی اور جب میں جرمن شہر بون میں سیکنڈ سیکریٹری تھا تو وہ ڈسلڈ ورف میں امریکی کونسل کے عہدہ پر تھی۔ لگژمبرگ سے تعلق رکھنے والی کولیٹ فلیش (COLLET FLESCH) کو چلتی پھرتی لائبریری کہا جاتا تھا۔ وہ لگژمبرگ کی وزیر خارجہ بنی۔

اپنی فصاحتی ایمانداری (INTELLECTUAL HONESTY) کے حوالے سے فلیچر سکول کے پروفیسرز لاثانی تھے۔ پروفیسر ہمفری (HUMPHRY) نے ہمیں اکنامک ڈویلپمنٹ پڑھایا۔ انہیں انڈین پلاننگ کمیشن کے ایڈوائزر کی حیثیت سے بھارت میں کئی سال گزارنے کا اتفاق ہوا، لہٰذا وہ پاکستان کی نسبت بھارت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ایک روز ان کے لیکچر میں قومی سرمائے کے استعمال پر بات ہوئی۔ ان دنوں لاہور میں گلبرگ میں دو سے چار لین کی سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے موقف اپنایا کہ ہمیں ایسی سڑکیں بنانے کی بجائے دیہات سے منڈی تک سڑکیں تعمیر کرنی چاہئیں تاکہ مزید غذائی وزرعی اجناس پیدا کر سکیں اور کسانوں کو بھی

اپنی فصلوں کا بہتر معاوضہ مل سکے۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ اس وقت پاکستان کو امریکہ سے زرعی امداد ''پی ایل480 فوڈ ایڈ'' ملتی تھی۔ توقع کے برعکس ہمفری نے پاکستان میں زراعت کی خستہ حالت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے جواب دیا، ''ہاں، آپ کو یہ کرنا چاہیے اگر واقعی آپ دیہات سے منڈی تک کچھ لا سکتے ہیں تو۔'' میں نے خفگی سے ہمفری کو کہا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ پاکستان میں ہم پی ایل480 فوڈ ایڈ سے قبل بھوکے مر رہے تھے۔ وہ مسکرائے اور مزید کوئی جواب نہ دیا۔

1961ء کے اوائل میں امریکی صدر کینیڈی نے ہمفری کو افغانستان بھیجا کہ وہ اندازہ لگائیں کہ وہاں سوویت یونین کے مقابلہ میں امریکہ کو کتنی امداد دینی چاہیے۔ ان کی امریکہ واپسی پر میں نے پوچھا کہ کیا انہیں پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کا جواب نفی میں تھا تاہم انہوں نے بتایا کہ پاک افغان بارڈر پر طورخم کے دورہ میں انہیں یہ احساس ضرور ہوا کہ دونوں طرف کے لوگ ایک جیسے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہم افغانستان سے کیوں لڑ رہے ہیں۔ 1960ء میں پاک افغان بارڈر پر دونوں ممالک کی افواج میں لڑائی چھڑی تھی۔ میں نے ہمفری سے کہا کہ اگر کسی عام شخص کا یہ موقف ہوتا تو الگ بات تھی مگر آپ جیسے دانا اور کئی ممالک گھومنے والے شخص سے یہ سن کر عجیب لگا۔ اگر میکسیکو اور کینیڈا کے ساتھ امریکی سرحدوں کو دیکھا جائے تو وہاں بھی دونوں طرف لوگ ایک جیسے ہیں مگر لڑائیاں پھر بھی ہوتی ہیں۔ ہمفری نے جواب نہیں دیا۔ وہ ہمارے امتحانی پرچہ جات دیکھے بغیر ہی حکومت کی جانب سے ایک بار پھر بیرون ملک روانہ ہو گئے۔

امتحانی بورڈ نے سب سے پہلے میرا انٹرویو کیا۔ انٹرویو میں پاس ہونا لازمی تھا۔ انٹرنیشنل لاء کے پروفیسر لیو گروس بورڈ کی صدارت کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اکنامک ڈویلپمنٹ کے مضمون میں میری کارکردگی کا اندازہ کیسے لگایا جائے گا کیوں کہ ہمفری پرچے دیکھے بغیر ہی بیرون ملک چلے گئے ہیں۔ گروس نے بتایا کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہمفری روانگی سے قبل ہی کلاس میں کارکردگی

کے باعث مجھے بہترین گریڈ دے چکے تھے۔

مجھے ہمفری سے ناخوشگوار رویہ کے باعث عمدہ گریڈ کی توقع نہ تھی۔ تاہم اچھے گریڈ کا سن کا مجھے حیرت ہوئی۔ انہوں نے انتہائی شاندار'' فصاحتی دیانت داری(INTELLECTUAL HONESTY)'' کا ثبوت دیا تھا۔

اس کے بعد گروس نے مجھ سے پاک بھارت دشمنی کی وجوہات اور اس حوالے سے بین الاقوامی قانون کے نا ہونے کا پوچھا۔ میں نے فوراً جواب دیا، انڈس واٹر (سندھ طاس) کا مسئلہ کیوں کہ دریا کنارے آباد ریاستوں کے حوالے سے کوئی خاص قانون و ضابطہ موجود نہیں ہے۔ بھارت دریا کی عبوری سطح پر ہونے کے باعث پاکستان میں پانی کے بہاؤ پر قابو رکھتا ہے اور بغیر روک ٹوک کے اپنی مرضی سے پانی استعمال کر رہا ہے۔ پروفیسر ہالم(HALM) کمپیر یٹو اکنامک سسٹمز پر کتاب لکھ چکے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ پاکستان میں کون سا نظام رائج ہے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کی کتاب میں موجود مختلف نظامات میں سے کوئی بھی نہیں۔ اس جواب پر پانچوں پروفیسروں نے زور دار قہقہہ لگایا اور یک زبان ہو کر کہا، 'Bravo' (شاباش)۔ یو ایس ڈپلومیٹک ہسٹری کے پروفیسر روبل جے (BARTLET) نے کلاس میں ہماری پہلی جنگ عظیم پر بحث کے حوالے سے کہا، ''میں نے تم سے کچھ سیکھا ہے۔'' انٹرویو میں میری کارکردگی کو بورڈ نے خوب سراہا۔ فلیچر سکول نے ہمارے دفتر خارجہ کو میری رپورٹ میں انٹرویو کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے اسے شاندار قرار دیا۔

فلیچر کی لائبریری بہت وسیع اور دن رات کھلی رہتی تھی۔ طلبا کے لیے چھوٹے کیبن بنے تھے جہاں وہ کسی بھی وقت آ کر پڑھ سکتے تھے۔ لائبریری میں اکثر کتابوں کی تمیں(30) کاپیاں موجود ہوتی تھیں تا کہ طلبا کو بآسانی دستیاب ہوں۔ کتب صرف شام 8 سے صبح 8 تک لے جائی جا سکتی تھیں اور اس کے بعد لائبریری کو واپس لوٹانا لازم تھا۔ ایک روز میں نے کتاب اس نیت سے نکلوائی کہ اسے صبح واپس کروں گا۔ سینٹرل ہیٹنگ سسٹم کے باعث رات کو میرا کمرا ضرورت سے زیادہ گرم ہو گیا۔ میں نے ہیٹنگ بند

کر کے کھڑکی کھول دی۔ کچھ دیر بعد برفانی طوفان آیا اور اس سے بیشتر کے مجھے علم ہوتا، میرا کمرا برف سے بھر گیا۔ مجھے برف باہر پھینکنا پڑی۔ کھڑکی بند کرتے ہی ہیٹنگ سسٹم دوبارہ چالو کیا۔ اس مشقت میں چند گھنٹے ضائع ہوئے اور جب صبح جاگا تو 10 بج چکے تھے۔ فلیچر پہنچتے 11 بج گئے۔ کتاب لوٹانے کے مقررہ وقت سے تین گھنٹے اوپر ہو چکے تھے۔ خوبصورت لائبریرین، شارلین مجھے بھاری جرمانہ کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اس سے ساجت کی کہ وہ ایک ڈالر جرمانہ کر دے اور میں یہ رقم اسے کچھ دنوں میں ہر بار چند سینٹ ادا کر کے چکا دوں گا۔ یہ جرمانہ پورا کرنے میں چند ہفتے لگے۔ آخری سینٹ وصول کرتے ہوئے شارلین نے کہا، "You are a big flirt"۔ میں نے پوچھا کہ ایسا میں نے کس کے ساتھ کیا تو اس نے جواب دیا، ''میرے ساتھ۔'' میں نے جواب دیا کہ YOU ARE EVEN A BIGGER FLIRT اور اس بات پر ہم دونوں نے خوب قہقہے لگائے۔

ٹفٹس یونیورسٹی میں کچھ روز کے لیے میں نے فرانسیسی زبان کی کلاس لی۔ چوں کہ سردی کافی تھی لہٰذا میں نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا جس کا بٹن خاصا ڈھیلا اور کبھی بھی گر سکتا تھا۔ گریجویشن کے دوسرے سال میں زیر تعلیم (سوفومور) ڈف والفرڈ (CRISTIANA DUFF WALFORD) جسے میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا، کو اندازہ ہو گیا کہ بٹن کبھی بھی گر سکتا ہے۔ اگلے روز وہ سوئی اور دھاگہ لائی اور وہ بٹن ٹھیک سے سی دیا۔ وہ امریکی سمندری ادارے کے سربراہ کی بیٹی اور ایک شان دار طالبہ تھی۔ میں اس سے دوبارہ 1995ء میں نیویارک ملا۔ اس وقت وہ ٹائم لائٹ میگزین کی نائب صدر تھی۔ میرا بیٹا ظافر ساتھ تھا جسے اس نے نیویارک کی چند اہم یادگاریں دکھائیں۔ ہم چند مشہور ترین ریستورانوں میں بھی گئے۔

فلیچر سکول نے اقوامِ متحدہ، نیویارک اور واشنگٹن ڈی سی کے دورے کا اہتمام کیا۔ نیویارک میں ہم اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل اور ادارے کے دیگر اہم اہلکاروں سے ملے۔ واشنگٹن ڈی سی میں ہماری ملاقات امریکی سیکریٹری آف سٹیٹ ڈین رسک

(DEAN RUSK)، محکمہ کے دیگر افسران، سینیٹرز اور کانگریس اراکین سے ہوئی۔

سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسران نے ہمیں بتایا کہ پلاننگ ڈپارٹمنٹ اس ادارہ کے اہم ترین محکموں میں سے ایک ہے۔ حیران کن طور پر پاکستانی دفتر خارجہ میں خارجہ پالیسی کے پلاننگ ادارہ موجود ہی نہیں۔

نیویارک سٹی کے گرد و نواح میں دھواں اگلتی صنعتوں کا جال بچھا نظر آیا۔ ہمارے ایک امریکی ساتھی نے کہا کہ یہ صنعتیں ماحول کو آلودہ کر رہی ہیں مگر انہی کی وجہ سے امریکہ عظیم تر بنا ہے۔ میری آنکھوں میں اداسی تھی کہ میرا ملک پاکستان کتنا پیچھے اور امریکی امداد پر چل رہا ہے۔

''ڈرگن پارکس'' نوآبادیاتی دور سے ہی بوسٹن کے مشہور ترین ریستورانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں کے ٹی بون سٹیک اور سٹرابری کیک مشہور تھے۔

امریکہ میں نسلی امتیاز زوروں پر تھا۔ گوری لڑکیاں، کالوں کے پیچھے قطار میں کھڑے ہونے سے انکار کردیتیں۔ ولسن ہاؤس کے اردگرد کا علاقہ امریکہ میں کم سنی میں فساد و جرائم کرنے والوں کے حوالے سے سب سے زیادہ بدنام تھا۔ وہاں زیادہ اطالوی نژاد رہتے تھے۔ بعض اوقات نوجوان ولسن ہاؤس میں ہماری قیام گاہ پر پتھر پھینکتے۔ مقامی پولیس نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ کوئی جوابی کارروائی کیے بغیر انہیں اطلاع کر دی جائے تا کہ ان نوجوانوں کو ہٹایا جا سکے۔ پاس ہی Elephant نامی مشہور نائٹ کلب تھا جو لوگوں سے بھرا رہتا۔ جب ہم وہاں کھانے کے لیے جاتے تو ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ ہوتا۔ بعض اوقات نوجوان ایک دوسرے سے لڑتے جبکہ ہمارے لیے یہ امر حیران کن ہوتا کہ لڑکیاں بھی اس میں شریک ہوتیں اور ایک دوسرے کو جوتیاں مارتیں۔

جورڈن مارش اور فیلین (FILENE) ڈپارٹمنٹل سٹورز میں شاپنگ بھی خوب رہتی۔ وہاں ورائٹی زیادہ اور قیمتیں کم ہوتیں۔

فلیچر میں یہ روایت تھی کہ طلبا اپنی، اپنی ملکی ثقافت کے حوالے سے دعوت کا اہتمام کرتے۔ ہمارے ساتھ مقیم، احمد کمال نے برطانوی ملکہ کی سالگرہ میں حصہ ڈالنے کا

کہا لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ اس کی بجائے افضال اور میں نے دعوت دی جس میں کمال کو مدعو نہیں کیا گیا کیوں کہ وہ اس کے حق میں نہ تھا۔ دعوت میں بہت سے لوگ شریک ہوئے اور کھانے پینے کا انتظام بھی وافر تھا۔ قریباً 10 بجے کمال آیا اور بلا جھجک دعوت میں شامل ہو گیا۔

امریکی فیملیاں غیر ملکی طلبا کو کرسمس اور نئے سال کی چھٹیوں کے دوران اپنے گھروں میں مدعو کرتی تھیں۔ وہ نہ صرف طلبا کا خیال رکھتیں بلکہ انہیں اچھا کھانا دیتیں۔ اور سیر و تفریح بھی کراتیں۔ مجھے ایک امریکی فیملی کے ساتھ اس ملک کے خوبصورت ترین علاقے کیپ کوڈ میں رہنے کا موقع ملا جہاں موسم خزاں میں پتے سرخ اور سنہری ہو کر دلکش سماں پیدا کر دیتے ہیں۔

برطانوی محکمہ خارجہ کا نوجوان افسر جان ڈریو (JOHAN DREW) ہمارا قریبی دوست تھا۔ ایک روز فلیچر کے طلبا سے اپنے، اپنے ممالک کی خصوصیات بیان کرنے کا کہا گیا۔ جان ڈریو نے برطانیہ کی درج ذیل خصوصیات بتائیں:

برطانوی فوج کو بیرون ملک پیش قدمی کے دوران دریا پار کرنا پڑا۔ دریا عبور کیے بغیر منزل تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ منزل تک جانے کا کوئی وسیلہ نہیں بن پا رہا تھا مگر فوج نے اپنی مدد آپ کے تحت پل تعمیر کیا اور اسے دریا پر بچھا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ حوصلہ مندی اور مضبوط ارادہ برطانوی کردار کے بنیادی عناصر ہیں۔

ہمارے ایک پروفیسر کو جب یہ پتا چلا کہ ہم پیرس جا رہے ہیں جہاں ہمیں چھے ماہ تک فرانسیسی زبان سیکھنا ہو گی تو انہوں نے چلتی پھرتی ڈکشنری ساتھ رکھنے کا مشورہ دیا جس کا مطلب تھا ہمیں پیرس میں کوئی گرل فرینڈ بنا لینی چاہیے۔

فلیچر سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی میں انٹرنیشنل لاء کی ڈگری لینے کے بعد میں اور افضال قادر واشنگٹن ڈی سی روانہ ہو گئے جہاں ہم نے مشہور کیتھولک یونیورسٹی، جارج ٹاؤن سے چھے ہفتوں پر مشتمل فرانسیسی زبان کا کورس کیا۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں امریکی صدر جان ایف کینیڈی اور دیگر اہم شخصیات زیر تعلیم رہیں۔ ہمیں یہ فیصلہ

کرنا تھا کہ یونیورسٹی ہاسٹل میں رہا جائے یا باہر کوئی اپارٹمنٹ کرائے پر لیا جائے۔ ہمیں یہ ادراک ہوا کہ اگر اپارٹمنٹ لیا گیا تو پھر ہم کلاسز کی بجائے وہیں سوئے رہیں گے اور یونیورسٹی کا دیدار مشکل سے ہی نصیب ہوگا۔ لہٰذا ہاسٹل میں رہنے کا فیصلہ کیا گیا۔

جارج ٹاؤن یونیورسٹی کیتھولک پادریوں کے زیر اہتمام تھی جو خصوصاً ہاسٹل میں قیام پذیر طلبا کے نظم وضبط کے معاملہ میں خاصے سخت تھے۔ ہر کمرے کی دیوار پر صلیبی نشان بنا ہوا تھا اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے طلبا کو بھی ہدایت تھی کہ اسے ہٹانے کی کوشش نہ کی جائے۔

ساتھ والے کمرے میں ہمارے دو یہودی دوست رہتے تھے۔ ایک روز پادری نے ایک ایک کمرے کا دورہ کیا۔ جب وہ ہمارے کمرے میں آئے تو صلیب کا نشان دیوار پر دیکھ کر خوش ہوئے۔ جب وہ ساتھ والے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ ہمارے یہودی دوستوں نے صلیب کا نشان دیوار سے اتار کر دراز میں رکھا ہوا تھا۔ پادریوں کو غصہ آ گیا اور انہوں نے فوراً صلیبی نشان کو دیوار پر ٹانگنے کا حکم دیا۔ دونوں طلبا کو تنبیہ کر دی گئی کہ اگر آئندہ ایسی حرکت ہوئی تو انہیں ہاسٹل اور یونیورسٹی سے نکال دیا جائے گا۔

پڑھائی کا معیار بہت اعلیٰ مگر ماحول خاصا آرام دہ تھا کیوں کہ ہم ریگولر سیشن کی بجائے سمر سکول میں داخل تھے۔ آغاز میں فرانسیسی زبان سمجھنا مشکل تھا مگر آہستہ آہستہ الفاظ ذہن نشین ہونا شروع ہو گئے۔ ہمارے ایک امریکی ساتھی کو فرانسیسی انتہائی مشکل لگتی اور اسے استاد کو بار بار ٹوکنے کی عادت بھی تھی۔ اسے جب سمجھ نہ آتا تو وہ اکثر کہتا، ''مادام 'Stoppez vous'''۔

آج کی نسبت اس وقت واشنگٹن ڈی سی اور جارج ٹاؤن بہت چھوٹے تھے۔ ہم دریائے پوٹومک (POTOMAC) کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے اور بعض اوقات ماؤنٹ VERNON بھی جاتے جہاں جارج واشنگٹن دفن تھے۔

سیاہ فاموں سے نسلی امتیاز عام تھا۔ خصوصاً ورکنگ کلاس میں یہودی مخالف

جذبات بھی پائے جاتے تھے۔اپنے دونوں یہودی ساتھیوں کے ساتھ ہم ایک فاسٹ فوڈ ریستوران گئے جہاں ایک امریکی سفید فام طالبہ پارٹ ٹائم کام کرتی تھی۔وہ پاس آئی تو ہم نے واشنگٹن ڈی سی میں سیاہ فاموں سے نسلی امتیاز کا ذکر کیا۔اس کا کہنا تھا کہ اسے سیاہ فاموں سے کوئی مسئلہ نہیں مگر اس امر سے نابلد کہ ساتھ ہی دو یہودی بھی بیٹھے ہیں،اس نے کہا کہ وہ یہودیوں کو کسی صورت برداشت نہیں کرسکتی۔

ایک روز میں کسی ضروری کام سے فرانسیسی زبان کی کتابیں کلاس میں رکھ کر ہی چلا گیا۔واپسی پر میں نے دیکھا کہ ایرانی طلبا اکٹھے کھڑے ایران میں سیاسی حالات پر بات چیت کررہے ہیں۔وہاں موجود ایک امریکی لڑکی کونی ڈیوسی مجھے اندر لے آئی اور میری کتابیں دیتے ہوئے مجھے ایرانی طلبا سے متعارف کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔انہوں نے مجھ سے یک زبان ہوکر پوچھا کہ میں شاہِ ایران کے ساتھ ہوں یا ایرانی عوام کے؟ میں نے بلاتوقف جواب دیا کہ پاکستانی،ایرانی عوام کو نہ صرف اپنا دوست بلکہ ایک ہی نسل سمجھتے ہیں۔تاریخ پر نظر دوڑائیں تو مذہبی،نسلی، معاشرتی اور دیگر کئی اعتبار سے ایران اور پاکستان ایک دوسرے کے خاصا قریب ہیں۔ یہ سنتے ہی ان کا رویہ خوشگوار ہوگیا۔اس کے بعد ہم بعض اوقات شام کو ملتے اور جارج ٹاؤن کے کسی ریستوران میں اکٹھے کھانا کھاتے۔

ہم امریکہ ہی تھے جب صدر ایوب خان یہاں آئے۔ان کا والہانہ استقبال کیا گیا کیوں کہ اس وقت پاکستان قریبی امریکی اتحادی تھا۔پاکستان اور امریکہ میں دوفوجی معاہدے،سینٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن اور ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن (سیٹواورسینٹو) ہوئے تھے۔مجھے یقین ہے کہ ان کا دورہ خاصا کامیاب رہا۔

کینیڈی کی موت کے بعد ان کی جگہ لینے والے امریکی نائب صدر لنڈن بی جانسن نے امریکہ میں پاکستانی سفیر عزیز احمد کی جانب سے صدرِ پاکستان کے استقبالیہ میں شرکت کی۔اس کا انعقاد میساچوسیٹس ایونیو کی چانسری میں کیا گیا۔ہمیں بھی استقبالیہ میں شرکت کی دعوت ملی اور وہاں ہماری ملاقات سفارت خانہ میں

وزیرِ معاشیات وزیر علی کی دلکش اور باوقار بیٹی شہناز وزیر علی سے ہوئی۔

ایوب خان کا وفد امریکی دارالحکومت کے انتہائی اعلیٰ ہوٹل میں قیام پذیر تھا جہاں منی سکرٹ پہنے ویٹریس خاطر تواضع میں مصروف تھیں۔ میں نے ہماری دیکھ بھال پر مامور سفارت خانہ کی سیکریٹری MARCIA سے ازراہِ مذاق دریافت کیا کہ ہم بھی کبھی اتنے شان دار ہوٹل میں رہیں گے۔ اس نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ''بالکل، اگر تم کبھی بھی پاکستان کے صدر بنے تو۔''

1960ء میں ویمنز لب موومنٹ بہت زور پکڑ چکی تھی۔ اس کا منفی پہلو یہ تھا کہ مردوں کے برابر درجہ کی کوشش میں ان کی عزت میں فرق آیا تھا جس کا مختلف مواقع پر انہیں سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے ایک خاتون کو بس میں سوار ہوتے دیکھا جس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی تاہم کسی بھی مرد نے اسے اپنی جگہ دینے کی پیشکش نہیں کی جس پر اس خاتون نے کہا، ''خواتین کی عزت کے دن کہاں گئے۔''

جارج ٹاؤن یونیورسٹی ہسپتال بہت مشہور تھا۔ ایک بار صدر لنڈن بی جانسن کو پیٹ میں گولی لگنے پر وہاں لایا گیا۔ یونیورسٹی میں میل جول بہت زیادہ اور غیر رسمی تھا۔ متعدد اساتذہ، کیتھولک پادری اور راہباؤں سے ہماری دوستی ہوگئی۔ سبھی بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔

ہمارا تیسرا ساتھی احمد کمال بہت زیادہ دبلا تھا، وہ بھی ہارورڈ سمر سکول سے روسی زبان کا کورس مکمل کر کے واشنگٹن ڈی سی آ گیا۔ ہمارے اصرار کے باوجود اس نے جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے کشادہ وہوادار (AIR CONDITIONED) ہاسٹل میں ساتھ رہنے کی بجائے وائے ایم سی اے ہاسٹل کو فوقیت دی جہاں اسے قوی الجثہ سیاہ فام کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا پڑا۔ میرا خیال ہے وہ رات کو بمشکل ہی سویا ہوگا کیوں کہ علی الصبح مجھے اس کا فون آیا کہ میں کسی طرح اسے مشکل صورتِ حال سے نکالوں۔ میں وائے ایم سی اے گیا اور اسے اپنے ہاسٹل لے آیا۔ ہم لنچ کے لیے کیفے ٹیریا گئے جہاں ہماری ملاقات اساتذہ، پادریوں اور راہباؤں سے ہوئی۔ وہ سب کمال

کو دیکھ کر حیران رہ گئے کیوں کہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ ان سب نے یک زبان ہو کر کمال سے پوچھا کہ کیا اس نے کافی عرصہ سے کچھ نہیں کھایا۔

جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کرتے ہی ہمیں امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ایک ہفتہ کام کرنا تھا۔ برطانیہ میں بھی ہم نے برطانوی دفتر خارجہ میں چھے ہفتے اور پیرس میں فرانسیسی دفتر خارجہ Quaid' Orsay میں بھی قریباً ایک ہفتہ گزارا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امریکی و فرانسیسی دفاتر خارجہ نے ہمیں اپنے کام کاج کے حوالے سے انتہائی اہم معلومات دیں۔

ٹفٹ کی بک شاپ پر میری ملاقات دراز قد اور خوبصورت ہیتھر ائن کیمبل (HEATHERANE CAMPBELL) سے ہوئی جو ایک ڈالر فی گھنٹہ کے عوض کام کرتی تھی۔ میری توقع کے برعکس وہ انتہائی دولت مند خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ اس کے والد سپیری رینڈ گائروسکوپ (GYROSCOPE) کے صدر اور اس کی والدہ نیویارک سٹاک ایکسچینج کی نائب صدر تھیں۔

نیویارک میں اگست 1961ء میں ہمارے قیام کے دوران اس کے والدین نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا جو لانگ آئی لینڈ میں بڑے رقبہ پر محیط تھا۔

اگلے روز ہیتھر نیویارک سٹی آئی اور ہم نے سارا دن اکٹھے عجائب گھر، تاریخی مقامات دیکھتے اور مشہور سٹیک ہاؤس میں لنچ کر کے گزارا۔ ہیتھر نے کئی بار میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے یہ نہیں کرنے دیا کیوں کہ اس سے پیشتر اس نے مجھے اپنا ہاتھ نہیں تھمایا تھا۔ شام کو بذریعہ ٹرین لانگ آئی لینڈ واپسی کے دوران اس نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس نے مجھے اپنا ہاتھ نہیں تھامنے دیا کیوں کہ میں غیر ملکی کی بجائے صرف پاکستانی لڑکی سے شادی کا خواہاں تھا۔ لہٰذا اسی وجہ سے وہ میرے ساتھ جذباتی وابستگی سے کتراتی تھی۔

نیویارک میں قیام کے آخری دنوں میں ہم کونسل جنرل ایس اے مقیت کی عدم موجودگی میں ان کے اپارٹمنٹ میں رہے۔ مقیت سے ہم پہلے بھی مل چکے تھے۔ وہ

بے مثال شخص تھے۔ وہ کسی لا علاج بیماری کے باعث جواں عمری میں انتقال کر گئے۔

ایک روز واشنگٹن ڈی سی میں پاکستانی سفیر عزیز احمد نے ہمیں مشورہ دیا کہ انگلینڈ جانے کے لیے ہمیں فرانسیسی لگژری بحری جہاز لبرٹے پر سفر کرنا چاہیے۔ ہم انگلینڈ سفارت کاری پر ایک کورس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے جس میں برطانوی دفتر خارجہ کے زیر اہتمام دولت مشترکہ کے رکن ممالک سے نوجوان سفارتکار بھی شامل ہونا تھے۔ ہم نے لبرٹے پر ہی سفر کیا۔ کھانے کی میز پر امریکی و یورپی ممالک کے ایک گروہ سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمریں پچاس کے قریب تھیں جب کہ میں بیس سے کچھ سال اوپر تھا۔

انہی میں سے ایک امریکی خاتون نے پہلے ہی روز مشورہ دیا کہ مجھے فوراً کوئی خاتون ڈھونڈ لینی چاہیے اور باقی کا سفر اس کے ساتھ ہی گزاریں۔ چوں کہ میں اس کی نسبت خاصا کم عمر تھا تو میں نے کہا مجھے پہلے ارد گرد دیکھنا پڑے گا اور پھر ہی کسی لڑکی سے دوستی کروں گا۔ اس نے کہا کہ بحری جہاز میں دوستی زیادہ وقت لگے بغیر ہی بنتی اور ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ایک نفسیاتی ڈاکٹر نے پھر ایک کہانی سنائی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی ایک مریضہ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں 27 سالہ نوجوان کے عشق میں مبتلا ہوئی اور اس سے شادی کر لی۔ اسی میز پر موجود اس چالیس سالہ خاتون نے کہا کہ یہ تو بہت غلط ہوا۔ ڈاکٹر نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ بہترین بات ہے کیوں کہ جب تک دونوں میں محبت برقرار رہے گی، وہ پُر لطف زندگی گزاریں گے۔

دورانِ سفر ہی ہم نے اس دَور کی مشہور ترین فلم 'Never on Sunday' دیکھی جس میں اداکارہ میلینا مرکوری نے بندرگاہ پر رہنے والی ایک طوائف کا کردار ادا کیا تھا۔ اسی فلم کا گانا 'you can kiss me' ان دنوں زبان زدِ عام تھا جس کے بول تھے کہ تم مجھے اتوار کے سوا ہر روز بوسہ دے سکتے ہو کیوں کہ اس دن میری چھٹی ہوتی ہے۔ میلینا مرکوری بعد ازاں یونانی کیبنٹ میں وزیر بھی رہی۔

اس خوب صورت بحری سفر کا مزہ سمندری طوفان نے کرکرا کر دیا۔ طوفان اتنا

تیز تھا کہ میزوں پر ڈالے کپڑے برتن اور چھری کانٹے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ میں بیمار پڑ گیا، ٹیکے لگے اور مجھے دو روز کمرے میں ہی آرام کرنا پڑا۔ ہمارا جہاز پلے ماؤتھ پر رکا جہاں کشتیوں میں سوار ہونے سے پہلے مسافروں کو لذیز ناشتہ کرایا گیا۔ کشتیوں پر ساحل پہنچتے ہی کمال نے مجھ سے ناشتے کا پوچھا کیوں کہ اسے بھوک لگی تھی۔ میں نے بتایا کہ میں پہلے ہی ناشتہ کر چکا ہوں اور پوچھا کہ اس نے کیوں نہیں کیا۔ کمال کا جواب تھا کہ وہ ویٹرز کو دورانِ سفر 100 ڈالر ٹپ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں اور افضال قادر بیروں اور دیگر عملے کو چھے روزہ سفر کے دوران 100 ڈالر فی کس ٹپ دے چکے تھے۔ کمال کا بیان حیران کن تھا کیوں کہ وہ جہاز کے سٹاف کو مناسب ٹپ دینے کی تلقین کرتا رہتا تھا۔

یہ اگست 1961ء کے دن تھے جب ہم انگلینڈ پہنچے۔ ہم پلے ماؤتھ میں ہی ایک رات بسر کرنا چاہتے تھے مگر انڈین اور پاکستانیوں کے ساتھ برطانوی لوگوں کا نسلی امتیاز اس حد تک تھا کہ کسی نے بھی ہمیں جگہ دینے کی ہامی نہ بھری۔ جب کوئی چارہ نہ بچا تو ہم ٹرین میں لندن کے لیے روانہ ہوئے جہاں ہم نے چھے ہفتے گزارے۔

برٹش کونسل کا عملہ خاصا معاون تھا اور انہی کی مدد سے ہمیں مناسب دام میں رہائش مل گئی۔ لندن آمد پر ہماری جیبیں خالی تھیں۔ ہم ہائی کمیشن گئے اور تھرڈ سیکریٹری شہریار ایم خان سے ملے۔ انہیں بتایا کہ ہمارے پاس چند پاؤنڈ بچے ہیں۔ شہریار خان نے کہا کہ آپ ان چند پاؤنڈوں میں گزارا کر سکتے ہو۔ ہم نے اپنی تنخواہوں اور مراعات کی ادائیگی کا تقاضا کیا۔ اکاؤنٹس آفس نے بتایا کہ پاکستان سے پے سلپ کے بغیر تنخواہ نہیں دی جا سکتی۔ تب ہم نے ڈپٹی ہائی کمشنر سجاد حیدر سے رابطہ کیا۔ وہ تعلقاتِ عامہ میں اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے، تاہم انہوں نے ہماری بات سنی اور اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کو فوری ہمارے بقایاجات ادا کرنے کا کہا۔ ہم نے ہائی کمشنر لیفٹیننٹ جنرل (ر) یوسف سے ملاقات کی جو بہت خوشگوار رہی۔ انہوں نے لندن میں اپنی رہائش گاہ پر ہمیں استقبالیہ میں بلایا جہاں ہماری ملاقات جلا وطن سابق صدر اسکندر مرزا اور ان کی اہلیہ ناہید مرزا سے ہوئی۔ بد قسمتی سے وہ غربت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے وہ

لندن کے کسی ہوٹل میں بطور مینیجر کام کرتے تھے۔

برطانوی دفتر خارجہ کے ساتھ تربیتی کورس بنیادی نوعیت کا تھا۔ ہم فلیچر سکول میں ہی کافی کچھ سیکھ چکے تھے۔ اس کورس کا سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں دیگر ممالک کے نوجوان سفارت کاروں سے ملاقات اور دوستی کا موقع ملا۔ ہماری ملاقات کین بارنگٹن سے بھی ہوئی جو افغانستان اور پاکستان میں جونیئر پوزیشن پر کام کر چکا تھا۔ اس کی افغان شاہی خاندان سے دوستی تھی اور ان کے ساتھ شام کو ٹینس کھیلا کرتا تھا۔ بعدازاں بارنگٹن پاکستان میں برطانوی ہائی کمشنر بھی رہا۔ وہ برطانوی 007 تھا جسے افغانستان اور پاکستان کا مکمل علم تھا۔

ایک دن لیکچر کے دوران انگلینڈ میں فلپائن کے سفیر نے اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ سفارتکاری میں جب کوئی ایک ملک سے دوسرے ملک جاتا ہے تو وہ اپنا دل وہاں چھوڑ جاتا ہے اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ بیٹھی ایک نوجوان برطانوی سفارتکار نے ایک بڑا دل بنایا، اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا اور تیسرا دل پہلے دونوں سے بھی چھوٹا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے دکھی انداز میں مخاطب ہوئی کہ جب اس نے برطانوی محکمہ خارجہ جوائن کیا تھا تو اس کا دل بڑا تھا جو اب چھوٹا رہ گیا ہے۔ وہ اپنی دو تعیناتیوں کے دوران دل کے کچھ حصے کھو چکی تھی۔

لندن سے ہم فرانسیسی زبان بہتر بنانے کے لیے پیرس چلے گئے۔ سفارت خانہ نے ہوٹل کی ساتویں منزل پر ہمارے لیے کمرے رکھوائے اور وہاں لفٹ بھی نہیں تھی۔ افضال قادر اور میں اپنے اپنے سامان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ساتویں منزل تک پہنچے اور نڈھال ہو گئے۔ ہوٹل لیفٹ بینک میں تھا اور یہ علاقہ جسم فروشی کا گڑھ تھا۔ ساتویں منزل سے ہمیں جسم فروش عورتیں مناسب جگہ پر قبضہ کے لیے ایک دوسرے کو جوتوں سے مارتی دکھائی دیں۔ رات گہری ہو رہی تھی لہٰذا ہم کچھ کھانے کے لیے نیچے آئے۔ کھانا کھاتے ہی افضال نے کہا کہ اس میں ساتویں منزل تک جانے کی ہمت نہیں لہٰذا وہ پاس ہی کسی ہوٹل کے گراؤنڈ فلور میں کمرا لے رہا ہے۔ اگلی صبح مجھے نہ صرف اپنا

بلکہ اس کا سامان بھی نیچے لانا پڑا کیوں کہ میں نے بھی ساتھ والے ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر کمرا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پیرس انتہائی شان دار اور خوب صورت شہر جب کہ فرانسیسی سمارٹ، خوش لباس، خوش شکل اور خوش خوراک تھے۔ برطانیہ کی نسبت فرانسیسی زیادہ دوستی پسند ہیں کیوں کہ ان میں نسلی امتیاز نہیں۔ ان کی نو آبادیوں میں بھی مقامی لوگ وہیں رہ سکتے تھے جہاں فرانسیسی خود رہتے تھے بہ شرط یہ کہ ان کے پاس وہاں رہنے کے وسائل ہوں۔ 1962ء میں بھی برطانیہ میں نسلی امتیاز پایا جاتا تھا جب کہ فرانسیسی برابری پر یقین رکھتے تھے۔ پیرس کا ماحول لندن کی نسبت دوستانہ تھا۔

پیرس میں ہم نے فرانسیسی زبان کے مشہور سکول Alliance Francaise میں پڑھنا شروع کیا۔ اس سکول کی شاخیں پوری دنیا میں ہیں۔ یہ سکول دریائے سین کے لیفٹ بینک جو لیٹن کوارٹرز کے طور پر بھی جانا جاتا تھا، میں واقع تھا۔ زیادہ طلبا کا تعلق یورپی ممالک جیسا کہ جرمنی، ہالینڈ اور سکینڈے نیویا سے تھا۔ طالبات اکثریت میں تھیں۔ ہماری جماعت میں تین مرد اور چالیس خواتین تھیں۔ پہلے سے چوتھے درجہ تک ہماری استانی مس گروسپیرن (GROSPIRON) تھیں، جو خوبصورت، ذہین اور دوستانہ رویہ رکھتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے خیال میں زیادہ تر طالبات اپنی زندگی میں کیا بننا پسند کریں گی۔ ان کا خیال تھا کہ میرا جواب ڈاکٹر، استاد یا اسی طرح کا کوئی پیشہ ہوگا جب کہ میرا جواب تھا کہ زیادہ تر خواتین اس دور کی خوبرو اور دلکش اداکارہ بریگیٹی باردت (BRIGITTE BARDOT) بننا چاہیں گی۔ مس گروسپیرن نے اس جواب پر حیرت کا اظہار کیا اور تنقید بھی کی۔ بہر حال انہوں نے لڑکیوں کا جواب سننے کا فیصلہ کیا۔ انہیں یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ طالبات کی اکثریت واقعتاً (BRIGITTE BARDOS) جیسی ہی بننا چاہتی تھی کیوں کہ وہ دلفریب، خوبصورت اور دولت مند تھی۔

ایک ایرانی طالب علم جو پہلے درجہ میں ہمارے ساتھ تھا، دوسرے سے تیسرے

درجہ کے امتحان میں ناکام ہوگیا۔ اگرچہ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ تیسرے درجہ کی کلاس کے باہر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میرے استفسار پر کہ وہ روز اس کلاس کے باہر کیوں کھڑا ہوتا ہے، اس نے بتایا کہ اسے مس گروسپیرن سے محبت ہوگئی ہے لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ انہیں ڈنر کی دعوت دے سکے۔ اس نے مجھ سے ادھار مانگا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ڈنر پر پیسے لگانے سے قبل دوسری جانب سے بھی محبت کا اندازہ لگا لے۔ میں نے دونوں کو کافی پر مدعو کیا جہاں ایرانی طالب علم کو اندازہ ہوا کہ مس گروسپیرن (MISS GROSPIRON) کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔

ایک روز جب کچھ ہم جماعت کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے تو ہالینڈ کی ایک خاتون ہمارے ساتھ آن بیٹھی۔ چوں کہ اسے انگریزی اور فرانسیسی دونوں ہی نہیں آتی تھیں لہٰذا ہمیں اس سے گفتگو کرنے میں خاصی مشکل ہوئی۔ ہماری اطالوی ہم جماعت نے کہا کہ زبان بھول جاؤ کیوں کہ ایک مرد اور عورت کے مابین صرف محبت کی زبان ہوتی ہے۔

سفارت خانہ نے ہمیں فرانسیسی زبان سے مزید آشنا کرنے کے لیے بارون بلوکیوول (BARON-BLQEVILLE) کی خدمات حاصل کیں جو انتہائی سلیقہ مند، محنتی اور فرانسیسی اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جب بھی اسے محسوس ہوتا کہ ہماری پڑھائی میں دلچسپی ختم ہو رہی ہے اور ہم اکتاہٹ محسوس کر رہے ہیں تو وہ حوصلہ دیتا اور فرانسیسی زبان میں کہتا، ''ارادے میں غیر پختگی کیوں۔'' یہ سنتے ہی ہم تندہی سے فرانسیسی سیکھنے لگ جاتے۔ ہم نے سنا تھا کہ اس کے والد نے اسے عاق کر دیا اور ساری جائیداد اپنی دوسری یہودی بیوی کے نام کر دی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ فرانس اور پیرس کی تقریباً ساری جائیداد یہودیوں کے پاس ہے اور فرانسیسی لوگ تو بس خاکروبوں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔

تعمیر کے شاندار نمونوں میں سے ایک ایفل ٹاور انیسویں صدی کے اواخر میں صنعتی نمائش کی غرض سے پیرس میں تعمیر کیا گیا۔ بارون بلوکیوول نے ہمیں ایک امریکی کی کہانی سنائی جو پیرس دیکھنے آیا تھا۔ اس نے ٹیکسی کرائی اور گھومنا شروع کیا۔

پہلا دورہ لوورز محل اور عجائب گھر کا کیا جہاں مونا لیزا کی تصویر رکھی گئی ہے۔ امریکی کے استفسار پر ٹیکسی ڈرائیور نے اسے بتایا کہ لوورز محل کی تعمیر میں بیس سال لگے۔ امریکی نے مذاق اڑاتے کہا کہ ایسی عمارات تو امریکہ میں چند برسوں میں تعمیر ہو جائیں۔ اسی طرح جب اس نے ایٹوئل اور لوئی 14 کے محلات دیکھے تو یہی کہا۔ آخر میں ٹیکسی ڈرائیور اسے ایفل ٹاور لے گیا جہاں امریکی نے پوچھا کہ لوہے کا یہ سٹرکچر کھڑا کرنے میں کتنا وقت لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے کہا، ''یقین کرو جب میں کل رات یہاں سے گزرا تھا تو یہ موجود نہیں تھا۔''

پیرس میں افضال قادر، خالد سعید بٹ اور میں نے 31 دسمبر 1961ء کی رات سینما جا کر نیا سال منایا۔ چوں کہ سال کا آخری دن تھا اس لیے بینک بند تھے اور وہ ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈ کا دَور نہیں تھا۔ ہمارے پاس چند ہی فرینکس رہ گئے جن سے کسی ریستوران میں کھانے کی قیمت ادا نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے انڈے، ڈبل روٹی، آلو اور مکھن خریدا۔ خالد سعید بٹ نے ہمارے نیو ایئر ڈنر کے لیے بہت لذیز آملیٹ اور آلو کے چپس بنائے۔

افضال اور میں پیرس میں ایک اپارٹمنٹ دیکھنے گئے جس کا اشتہار اخبار میں شائع ہوا تھا۔ ہم نے تین جرمن خواتین کو مکان مالکان کے ساتھ کرایہ طے کرتے دیکھا۔ ہمیں دیکھتے ہی مالکہ مکان نے خواتین کو چلتا کیا اور ہمیں کرایہ دار بنانے کو تیار ہو گئی۔ ہمیں مالکہ مکان کا یہ فقرہ سن کر حیرت ہوئی کہ مرد، خواتین کی نسبت زیادہ صفائی رکھتے ہیں۔

میں ایک دولت مند یہودی خاتون مسز لیونٹ (LES HALLES) کے ہاں پے انگ گیسٹ (PAYING GUEST) کے طور پر رہتا تھا۔ وہ جرمنی کے ہاتھوں پیرس کی فتح کے دنوں سے وہاں قیام پذیر تھیں۔ ایک جرمن سپاہی ان کا دوست تھا جس نے انہیں رائفل کا خنجر سبزیاں اور پھل کاٹنے کے لیے دیا تھا۔ ان کا قریبی گاؤں میں بھی ایک گھر تھا جہاں سے وہ ہفتہ بھر کے لیے انڈے، سبزیاں، پھل اور ضروریات کی دیگر

اشیا لے آتی تھیں۔ مسز لیونٹ جہاں دیدہ خاتون تھیں جو ہمیں پیرس میں رہنے کے حوالے سے مشورے دیا کرتی تھیں۔ ان کے ہاں قیام کے شروع کے دنوں میں انہوں نے مجھے پیرس میں برہنہ شو نہ دیکھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس کی بجائے لائیڈو (LAIDO)، فولیز برجری (FULLIES BERGRI) اور مولن روگ (MOULEN ROG) جا کر شو دیکھیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بہترین برہنہ شو تو صرف اپنی خواب گاہ میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

پیرس کی سب سے بڑی غذائی اجناس کی ہول سیل منڈی لیس ہیلز (HALLES) تھی۔ فرانس اور دیگر ممالک سے غذائی اجناس وہاں دستیاب ہوتیں۔ یہ جگہ گورے ریستوران اور زرق برق جسم فروش خواتین کے لیے بھی مشہور تھی۔ Irma La Douce نامی فلم میں اس منڈی کی حقیقت پر مبنی فلم بنائی گئی تھی جہاں پولیس، مافیا اور عام شہری اکٹھے ہوتے ہیں۔ کسان اپنی اجناس بیچنے کے بعد گلیوں میں گھومتی خواتین کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ایک دن چیمپس الیسیز پر میں نے ایک خوب صورت لڑکی کو اکیلے جاتے دیکھا۔ میں نے بلاتوقف اسے کہا کہ کسی کے ساتھ چلنا زیادہ بہتر ہے۔ اس نے فوراً مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ بعدازاں اس نے مجھے بتایا کہ وہ فرانسیسی فلم انڈسٹری کی صف اوّل کی اداکاراؤں میں سے ایک تھی۔

پیرس سے واپسی سے قبل ہم نے گھڑیاں خریدنے کی غرض سے جنیوا جانے کا منصوبہ بنایا۔ پیرس واپسی پر فونٹین بلیو، جہاں نپولین نے سر تسلیم خم کیا، کے مقام پر ہماری گاڑی کو حادثہ پیش آیا۔ برف سے ڈھکی سڑک پر ہماری گاڑی الٹ گئی۔ اسی دوران ایک بڑا ٹرک ہمارے پاس سے گزرا۔ خوش قسمتی سے ہم محفوظ رہے۔ میں نے افضال اور اس نے مجھ سے خیریت دریافت کی۔ ہم دونوں ٹھیک تھے۔ ہمیں احساس ہوا کہ گاڑی کا انجن چل رہا ہے۔ بمپرز پہیوں کے ساتھ جڑ گئے تھے جنہیں ہم نے الگ کیا اور گاڑی چلاتے پیرس آ گئے۔

یورپی تاریخ پر اینگلو سیکسن کی کتابوں میں نپولین کو جنگجو دکھایا جاتا ہے۔ پیرس میں مَیں ایک بک شاپ پر گیا تو میری نگاہ نپولین پر لکھی کتاب پر پڑی۔ اس کا پہلا جملہ تھا، ''یہ شہنشاہ امن کا داعی تھا۔'' واٹرلو کا مقام جہاں نپولین کو شکست ہوئی، برسلز کے باہر واقع ہے۔ نپولین کو قابل احترام سمجھا جاتا ہے اور وہاں ہر شے اس کے گرد گھومتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نپولین ہی فتح یاب ہوا تھا۔ پیرس میں لیس انویلائیڈز (LES INVALIDES) جہاں نپولین کا مقبرہ ہے، فرانسیسیوں کے لیے درگاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ بون میں ایک امریکی سفارتکار کو نپولین کے مقبرہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس نے واپسی پر کہا کہ فرانسیسیوں نے ایک جنگجو کو اس قدر عزت و احترام دے رکھا ہے۔ تاہم تاریخ ویسی ہی دکھتی ہے جیسا ہم اسے دیکھتے ہیں۔ ایک، کے لیے ہیرو دوسرے کی نظر میں جنگجو ہوسکتا ہے۔

میجر جنرل (ر) این اے ایم رضا فرانس میں پاکستان کے سفیر تھے۔ سفیر اور ہمارا کوئی رابطہ نہیں تھا جب کہ دیگر سفارتی سٹاف او ماتحت عملہ سے ہمارے قریبی روابط تھے۔ پیرس میں دفاعی اتاشی ایوب خان کی کابینہ میں وزیر، ایم فاروق کے داماد تھے۔ وہ اس قربت کا استحصال کرتے۔ ان کا دوسروں سے رویہ بھی نامناسب تھا۔ دفتر سے رخصتی اور تالے لگنے کے باوجود وہاں برقی قمقمے جلتے رہتے جو سرمایہ کا ضیاع تھا۔ جنرل رضا میں بھی انہیں روکنے کی ہمت نہ تھی۔ ایک روز سفیر نے افسران اور سٹاف ممبران کی میٹنگ طلب کی اور سفارت خانہ بند ہونے کے بعد بجلی کے آلات بند نہ کرنے پر ان کی سرزنش کی۔ مجھے یہ اچھا نہ لگا کیوں کہ جنرل میں ہمت نہ تھی کہ وہ اصل مجرم پر ہاتھ ڈال سکیں۔ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے ان سے کہا کہ آپ اصل مجرم کو پکڑیں ورنہ آپ کی نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اپریل 1962ء میں ہمیں تربیتی کورس کی غرض سے پاکستان جانا تھا۔ ایک شام میں اور افضال قادر چیمپس الیسیز میں چہل قدمی کر رہے تھے جہاں ایک نابینا شخص 'I love Paris in spring time' اپنے اکارڈین (ACCORDION)

پر بجا رہا تھا۔ افضال فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا، ''وحید، میں پاکستان واپس نہیں جانا چاہتا۔'' میں نے افضال سے کہا کہ میں جسمانی طور پر پیرس میں موجود ہوں مگر روحانی طور پر آج بھی پاکستان ہوں۔ ہم نے پیرس سے روم اور پھر کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران افضال بون دیکھنے گیا جہاں اس کی ملاقات حال ہی میں پیرس سے بون منتقل ہوئے سیکنڈ سیکریٹری ہمایوں رشید سے ہوئی جو اسے بیڈ نیونھر (BADNEUNHAR) کے جوئے خانے لے گیا جہاں وہ خاصی رقم ہار گیا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ پیرس سے کراچی کی ٹکٹ خرید سکتا۔ میں نے اسے ٹکٹ خرید کر دیا لیکن وہ رقم مجھے کبھی واپس نہ ملی۔

پیرس میں مجھے اپنڈکس کا آپریشن کرانا پڑا۔ یہ میری زندگی کا پہلا آپریشن تھا جو پگال کے ایک کلینک میں ڈاکٹر ہینری لیوو (LEVEAU) کے زیر سرپرستی ہوا۔ میں اپنڈکس کے لیے اپنے ایکسرے لانا بھول گیا تھا۔ میں نے سرجن سے پوچھا کہ کیا مجھے واپس جا کر ایکسرے لانے کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ بے ہوشی کے لیے کلوروفارم لگانے سے پہلے مجھے انجکشن دیا گیا۔ میں نے سرجن سے پوچھا کہ بے ہوش ہونے میں کتنا وقت لگے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ آپریشن کے بعد جو پہلا شخص مجھ سے ملنے آیا وہ مکان مالکن مسز لیونٹ تھیں۔ میں نے ان کی آواز سنی مگر جواب نہ دے سکا۔ وہ میرے لیے تازہ پھل لائی تھیں۔ مسز لیونٹ کے بعد بورس آیا جس کا تعلق یوگوسلاویہ سے تھا، وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر اور میرے ساتھ فرانسیسی زبان کے کورس میں تھا۔ کچھ روز قبل اس نے مجھ سے دو سو فرینکس ادھار مانگے تھے کیوں کہ وہ جرمنی جا کر نئی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ بورس نے کہا تھا کہ وہ جرمنی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتے ہی میری رقم لوٹا دے گا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ افضال قادر اگلے روز آیا۔ سفارت خانہ سے کسی نے آنے کا تردد نہ کیا کیوں کہ محکمہ خارجہ پاکستان میں پروبیشنرز کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔

دنیا بھر میں متعدد قدیم شہروں کی طرح پیرس میں داخلے کے لیے بھی کئی

دروازے تھے۔ان میں سے ایک کا نام Porte de Pantin تھا جس کے معنی ''احمقوں کا دروازہ'' ہیں۔ایک دن افضال قادر نے مجھ سے کہا اس کی ملاقات دو فرانسیسی خواتین سے ہوئی ہے جنہوں نے اسے احمقوں کے دروازے پر ملنے کا کہا ہے۔میں اس ملاقات کے حوالے سے مشکوک تھا، تاہم افضال کی خواہش پر ہم وہاں پہنچ گئے اور کافی دیر انتظار کرنے کے باوجود وہ خواتین نہ آئیں۔انہوں نے ہمیں واقعی بے وقوف بنایا تھا۔

ایک روز ہم نے بذریعہ سڑک جرمنی، ہالینڈ، بلجیئم اور فرانس کے سفر کا ارادہ کیا۔ایمبیسی ڈرائیورز میں سے ایک ہنگری سے ہجرت کر کے آیا تھا اور اس کے پاس بڑی مگر پرانی Citroen تھی۔افضال اور خالد سعید بٹ نے، جو بعد ازاں ڈی جی کلچر تعینات ہوئے، ڈرائیور کی بڑی اور آرام دہ گاڑی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔پروفیسر نے میرے ساتھ چھوٹی واکس ویگن پر سفر کو ترجیح دی۔ میں نے کہا کہ ہمارے باقی ساتھی بڑی اور آرام دہ گاڑی میں سفر کر رہے ہیں جب کہ ہم اس چھوٹی گاڑی میں تنگ ہو کر بیٹھے ہیں۔پروفیسر بلوکیوول (BLOQUE VILLE) نے کہا کہ فکر مت کرو، تم جلد انہیں اپنی بڑی گاڑی کو دھکا لگاتے دیکھو گے۔اس کا اندازہ ٹھیک ثابت ہوا اور ہمیں راستے میں وہ لوگ ہمارا انتظار کرتے نظر آئے کیوں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا جس کے باعث وہ مزید چلنے سے قاصر تھی۔ہم نے ڈرائیور کو وہیں چھوڑا اور باقی دونوں ساتھیوں نے ہمارے ساتھ سفر جاری رکھا۔ایمسٹرڈیم سے پیرس واپسی پر سڑک دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔پروفیسر نے آگے والی گاڑی کے پیچھے جانے کی ہدایت کی۔کچھ دیر بعد ہمیں احساس ہوا کہ گاڑی ایک کھائی میں ہے کیوں کہ اگلی گاڑی بھی وہیں گری تھی۔

روس میں بولشویک انقلاب کے بعد متعدد سفید فام روسی، فرانس ہجرت کر گئے اور ان میں سے چند نے پیرس کے مضافات میں ڈیرے جما لیے۔کسی نہ کسی طرح ہم نے ان سے اچھے تعلقات استوار کر لیے اور کبھی کبھار ملنے چلے جاتے۔ وہاں ریستورانوں میں اچھی روسی خوراک میسر ہوتی اور ہم خوب مزہ کرتے۔

میں نے روم کے لیے ٹرین لی جہاں قریباً ایک ہفتہ قیام کے دوران میری میزبانی سیکنڈ سیکریٹری اکرم ذکی اور پی آئی اے نے کی۔ دونوں کی میزبانی خوب رہی اور میں نے روم اور اس سے باہر مشہور مقامات دیکھے۔ وہاں عام یقین ہے کہ روم کے ٹریوی(TREVI) فاؤنٹین میں کوئی بھی تین سکے پھینکے، وہ ایک بار پھر روم ضرور آتا ہے۔ پہلی بار میں نے روم سے سوٹس، شرٹس اور جوتے لیے اور اطالوی فیشن کا گرویدہ ہو گیا۔ نوکری کے دوران اور بعد بھی میں اطالوی کپڑے، جوتے اور ٹائیاں پہنتا رہا۔ اس وقت ہر کوئی ایسا کر سکتا تھا کیوں کہ اشیا سستی اور پاکستانی کرنسی مضبوط تھی۔ اس وقت امریکی ڈالر 4.75 اور پاؤنڈ سٹرلنگ 11 روپے کے برابر تھا۔ جرمن مارک 1.20 روپے کے برابر تھا۔ وہ سنہری دَور تھا جب پاکستانی بہت کم رقم میں بیرون ملک سیر و تفریح، پڑھائی اور علاج و معالجہ کے لیے جا سکتے ہیں۔

جب ہم کراچی لوٹے تو دارالحکومت اسلام آباد منتقل کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا تاہم عبوری دارالحکومت کراچی میں ہی تھا۔ دفتر خارجہ موہٹہ پیلس میں واقع تھا۔ یہ جگہ قائداعظم کی ذاتی جائیداد تھی۔ کراچی میں متعدد وزارتوں اور جوہر آباد میں اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان ریونیو میں اکاؤنٹس کی تربیت کے بعد ہمیں مختلف جگہوں پر آرمی یونٹس کے ساتھ بھیجا گیا۔ مجھے پشاور میں واقع پنجاب رجمنٹ شیر دل سے منسلک کیا گیا۔ صدر ایوب خان اور گوہر ایوب اس رجمنٹ میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل علی ضامن نقوی جو بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل بنے، نے بٹالین کی کمان سنبھالی۔ کیپٹن آصف نواز جنجوعہ جو بعد میں چیف آف آرمی سٹاف بنے، ایڈ جوٹنٹ تھے۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر کے ماتحت این ڈبلیو ایف پی میں آرمی یونٹس موسیٰ ٹرافی مقابلہ برائے کارکردگی میں شریک تھے۔ ہماری آمد کے اگلے ہی روز آصف نواز نے غلطی کرتے ہوئے سویلین خارجہ اور سول سروس کے پروبیشنرز کو بھاری بھرکم جوتے، جو ان کو پورے بھی نہ تھے، پہنا کر 11 کلومیٹر دوڑ لگوا دی۔ وہ دوڑ اور کھیلوں میں ہماری شرکت کا آخری دن ثابت ہوا کیوں کہ ہمارے پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ آصف

نواز کو ہمیں رائفل پر نصب خنجر کے ساتھ دشمن پر حملہ کرنے کی مشق کرانے کا ایک اور غیر معقول خیال آیا۔ ہمیں شرمندگی ہوتی تھی کہ اس نے ہمیں کیا کرنے کو دے دیا ہے۔ خوش قسمتی سے کور کمانڈر نے ہم سے ملاقات کا کہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر پریڈ گراؤنڈ سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے بغیر یونیفارم کے چار افراد کو رائفل کے خنجروں سے حملہ کی مشق کرتے دیکھا۔ پوچھنے پر انہیں بتایا گیا کہ یہ سول اور خارجہ سروس کے افسران ہیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان زیر تربیت افسران کو تربیتی عرصہ تک ان کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ بعد ازاں ہم موسیٰ (EFFICIENCY) ٹرافی مقابلہ برائے کارکردگی کے حوالے سے این ڈبلیو ایف پی میں ہر جگہ ان کے ساتھ جاتے تھے۔ دورے بہت اچھے رہے کیوں کہ ہمیں پورا صوبہ دیکھنے کا موقع ملا۔ تاہم شام کٹھن ہوتی تھی کیوں کہ کور کمانڈر بہت زیادہ شراب نوشی کے عادی تھے اور رات گئے تک پیتے رہتے اس لیے کھانا اس کے بعد ہی ملتا۔

محکمہ پولیس میں میرا سابق ساتھی ملک نذیر احمد پشاور سے باڑ رشبقدر میں تعینات تھا۔ دورہ کے دوران ہم اس سے اور اسسٹنٹ پولیٹیکل آفیسر سے ملے۔ اسسٹنٹ پولیٹیکل آفیسر سے ملاقات کے دوران ہم نے اسے ایک ملاّ کو پاکستان سے افغانستان جانے سے یہ کہتے ہوئے منع کیا کہ اس طرح اس کی حب الوطنی مشکوک ہو جائے گی۔ ملاّ کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان میں اسی وقت رہ سکتا ہے کہ وہ یہاں شادی کرے جو ایک مہنگا سودا ہے۔ پاکستان کی طرف سے اسے رقم بھی ملی مگر اتنی نہ تھی کہ وہ شادی کر سکے۔

فوج سے فراغت کے بعد ہم مشرقی اور مغربی پاکستان کے دورہ پر نکل پڑے۔ ہم نے مشرقی پاکستان کا ایک ایک کونہ دیکھا جہاں ہمیں بہت پیار ملا۔ سندر بن میں ہم نے ایک رات کشتی میں گزاری۔ اگلے روز سندر بن کی سیر اور ہرن کی تلاش کے دوران ہمارا سامنا ایک شیر سے بھی ہوا جو ہم سے چند میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن پھر لوٹ گیا۔

تین برسوں پر محیط پروبیشنری تربیت ختم ہونے پر ہمیں وفاقی پبلک سروس

کمیشن کے زیر تحت امتحان دینا تھا۔ انٹرنیشنل لاء بنیادی مضامین میں سے ایک تھا۔ مجھ سے پروفیسر لیو گروس کے لیکچرز پر مشتمل نوٹس کھو چکے تھے۔ میں نے ہیتھر (HEATHER) سے کہا کہ وہ مائیک چوئی (MIKE CHOI) (کورئین دوست) سے نوٹس لے، انہیں ٹائپ کرے اور مجھے بھیج دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور انٹرنیشنل لاء کے امتحان میں ان سے بھرپور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ نوٹس سو سے زائد صفحات پر مشتمل تھے جس کے لیے یقیناً ہیتھر کو بہت محنت کرنا پڑی ہوگی۔ پرچہ بنانے والا موضوع سے ہٹا ہوا تھا مگر ان نوٹس نے مناسب و موزوں جواب دینے میں خاصی مدد کی۔ میں ہیتھر (HEATHER) سے ستمبر، اکتوبر 1999ء کو واشنگٹن ڈی سی میں ملا۔ میں وہاں وزیراعظم نواز شریف کا سپیشل ایلچی بن کر گیا تھا اور امریکہ کی حکومت کے کانگریس اور سینیٹ کے عمائدین کو پاکستان اور ہندوستان کے مسائل پر مطلع کیا تھا۔ ہیتھر (HEATHER) کا خاوند امریکن سینٹ میں اعلیٰ عہدیدار تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا اور ہر طرح سے میری مدد کرنے کی کوشش کی۔

کشمیر 1962ء

برطانیہ نے برصغیر میں حکومت کے دوران چند علاقوں بشمول چین کے ساتھ انڈین بارڈر پر قبضہ کر رکھا تھا جو دراصل چین کا علاقہ تھا۔ چین نے دباؤ کے تحت انڈیا کے ساتھ بارڈر کی حد بندی کے معاہدہ سے انکار کر دیا۔ اس کے جواب میں برطانیہ نے چین سے ملحقہ اضافی رقبہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس کے برعکس پاکستان نے 1962ء میں پُرامن طور پر چین کے ساتھ سرحدی حد بندی کا معاملہ حل کر لیا۔ انڈیا نے برطانوی حکمت عملی کے تحت اس حصہ پر اپنا قبضہ جمانا چاہا جو برطانیہ نے چین سے چھینا تھا۔ تب تک چین یہ علاقہ اپنے قبضہ میں کر چکا تھا۔

1962ء میں بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنے جرنیلوں کو حکم دیا کہ وہ چین کو شمال مشرقی انڈیا میں بارڈر کے چند علاقوں سے نکال باہر کریں۔ اس کے

بعد سرحد کے دونوں جانب سے حملے ہوئے اور بالآخر بھارتی فوج کو شکست ہوئی۔ جرنیل اور سپاہی اپنی زندگیاں بچانے کے لیے چوکیاں چھوڑ کر واپس بھاگے۔ انڈین آرمی شکست اور خوف سے تتر بتر ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ چو این لائی (CHOU EN LAI) نے پاکستان کو کشمیر پر قبضہ کا کہا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ بھی کہا کہ چین نے پاکستان کو کشمیر پلیٹ میں رکھ کر دے دیا۔ آغا شاہی اور ان کے حواری امریکہ اور برطانیہ کے مسئلہ کشمیر بارے بہکاووں میں آ چکے تھے۔ دونوں بڑی طاقتوں نے مسئلہ کشمیر حل کرانے کی بجائے بھارت کو چار سے پانچ ماؤنٹین ڈویژنز بنانے کے لیے فوجی ساز و سامان دیا جو 1965ء میں پاکستان کے خلاف استعمال ہوئیں۔ بہت سال پہلے پاک بھارت تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے آغا شاہی سے پوچھا تھا کہ انہوں نے 1962ء میں کشمیر کیوں نہیں لیا۔ ان کا جواب تھا کہ ایوب خان نے ان کا مشورہ رَد کر دیا۔ یہ یاد رکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ شاہِ ایران نے صدر ایوب خان سے ایک خط میں انڈیا کے خلاف کسی قسم کی فوجی کارروائی نہ کرنے کی استدعا کی تھی۔

تیسرا باب

اقتصادی معجزات کے شہر میں تعیناتی

بطور تھرڈ سیکریٹری میں لندن یا بون میں سے کسی ایک جگہ تعینات ہو سکتا تھا۔ اگر چہ بون چھوٹا شہر مگر اپنے اقتصادی معجزات کے باعث وفاقی جمہوریہ جرمنی کا دارالحکومت اور تیزی سے اقتصادی ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ اس وقت پاکستان کو دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ امداد جرمنی سے ملتی تھی۔ مجھے یہ علم بھی تھا کہ لندن میں تھرڈ سیکریٹری کی ذمہ داری صرف پروٹوکول تک محدود ہے، مثلاً اہم شخصیات کو ایئرپورٹ سے لانا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور دوران سفران کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولنا اور بند کرنا وغیرہ۔ اس طرح پیشہ ورانہ صلاحیتیں مدھم پڑ جاتی تھیں۔ لہٰذا میں نے پہلی تعیناتی کے لیے بون کا انتخاب کیا۔

بون تعیناتی ہوئی تو میں نے وہاں کی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے لندن سے گرم ملبوسات خریدے۔ لندن ہائی کمیشن بھی گیا اور دو افسران سے ملا جن میں سے ایک کا تعلق پنجاب اور دوسرے اے ڈبلیو شمس العالم کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ پنجابی افسر نے اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہوئے بتایا کہ وہ سیاسی ذمہ داریاں نبھاتا جب کہ بنگالی صرف پروٹوکول تک محدود ہے۔ شمس العالم سے ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی بہتر شخص ہے۔ اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا، گرم ملبوسات خریدنے کے حوالے

سے مشورہ دیا اور قریبی ریستوران میں دوپہر کے کھانے کے لیے لے گیا۔ میری اگلی منزل پیرس تھی جہاں پرانے دوستوں سے ملاقات اور متعدد مقامات کی سیر کی۔ میں Alliance Francaise بھی گیا اور ہماری خوبرو استانی مس گروسپرن سے ملا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ایک باوقار، خوبصورت اور بااخلاق خاتون تا حال غیر شادی شدہ ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کے والدین جہیز بنانے میں مصروف ہیں۔ جیسے ہی جہیز مکمل ہو جائے گا، وہ شادی کر لیں گی۔

بون میں سابق تھرڈ سیکریٹری اقبال رضا کا خرطوم تبادلہ ہو چکا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا مزید دو مہینے بون رہنے میں کامیاب ہو گئے۔ وزارتِ خارجہ نے مجھے لندن جانے کی پیشکش کی جسے میں نے انکار کر دیا۔ اقبال رضا خاصے ناخوش تھے اور انہوں نے امریکی گیٹو، پلیٹرسڈورف (PLITESDORF) میں موجود اپنا اپارٹمنٹ بھی خالی کر دیا۔ انہوں نے بغیر اطلاع دیئے تھرڈ/سیکنڈ سیکریٹری کا سرکاری فرنیچر بھی مشن کے افسران میں تقسیم کر دیا۔ کس کو کیا ملا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے مجھے پاکستان کو جرمنی کی جانب سے مالی امداد کے منصوبوں کا پراجیکٹ بھی تھما دیا۔ اس پراجیکٹ کی لسٹ تھماتے ہوئے انہوں نے بہت غلط انداز میں کہا، ''مجھے نہیں لگتا آپ یہ سمجھ پائیں گے۔'' حالاں کہ اقتصادیات میں ماسٹرز اور فلیچر سے تعلیم کے باعث معاشی معاملات کو میں ان سے بہتر سمجھ سکتا تھا۔ ان کے طنزیہ فقرے کے باوجود میں نے تحمل مزاجی سے کام لیا۔ امریکی سفارت خانہ جو کہ فلیٹ کا مالک تھا، یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اپارٹمنٹ خالی ہوتے ہی وہ نئے تعینات شدہ افسر کو کرائے پر نہیں دے گا۔ لہٰذا مجھے مجبوراً کہیں اور مکان ڈھونڈنا پڑا جس میں دو ہفتے لگے۔ یہ عرصہ میں نے فرسٹ سیکریٹری نیاز اے نائیک کے گھر گزارا اور بالآخر بون کے خاص علاقہ وینس برگ میں ایک عمدہ گھر ملنے پر میری تلاش ختم ہوئی۔ یہ ایک جرمن سفیر فرائیز وون رچ تھوون (FRIEHERR VON RICHT HOVEN) کی ملکیت اور روزمرہ ضروریات سے آراستہ تھا۔ پلیٹرسڈورف پاکستانیوں کی آماج گاہ اور یہاں بسنے والے خاندانوں کے لیے افواہوں کا ذریعہ بن چکا

تھا۔ وینس برگ 20 کلومیٹر دُور تھا اور رش کے دوران نقل و حمل میں آدھا گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ میں افواہوں کی آماج گاہ سے دُور رہتا تھا ورنہ غیر شادی شدہ نوجوان کو ان کی لپیٹ میں آتے کتنا وقت لگتا؟

جب میں بون پہنچا تو سابق سیکریٹری فنانس و گورنر سٹیٹ بینک پاکستان محمد ایوب، جرمنی میں سفیر تھے۔ وہ اور ان کے خاندان نے میرا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اپنوں جیسا سلوک کیا۔ اقتصادی معاملات میں وہ گہری بصیرت رکھتے تھے اور اسی لیے میرے اُستاد بھی بن گئے۔ ہر صبح بالائی منزل پر اپنے دفتر جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملتے اور ہم اقتصادی و سیاسی معاملات پر گفتگو کرتے۔ وہ فرینکفرٹ میں جرمن ڈویلپمنٹ بینک کے عہدہ داران سے ملاقات کے لیے جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے اور باہمی گفت و شنید میں حصہ لینے کا موقع بھی دیتے۔ وہ انتہائی ذہین اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین انسان بھی تھے۔ جب بھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو ان کا مسکراتا چہرا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے بچے مجھے ''وحید بھائی'' بلاتے تھے۔

جونیئر افسر اور غیر شادی شدہ ہونے کے باعث جرمن دوست بنانا آسان تھا۔ امریکی سفارتخانہ کا کلب غالباً وہ واحد جگہ تھی جہاں ہر قسم کے کھیل اور اچھا کھانے کو ملتا تھا۔ وہاں ٹینس، سکواش اور بیڈمنٹن کھیل سکتے تھے اور جی چاہا تو بالنگ یا تیراکی کر لی۔ جمعہ کی سہ پہر سے ہی کلب میں ہجوم ہوتا تھا اور لوگ آدھی قیمت پر کھانے اور مشروبات کے لیے آتے۔

اس طرح وہ دن جرمن اور دیگر ممالک کے باسیوں سے ملاقات کے لیے اہم ہوتا۔ جرمن خارجہ افسر نے غیر شادی شدہ افراد کے لیے امریکی سفارتخانہ سمیت دیگر مقامات پر کلب بنا رکھا تھا۔ اس تنظیم نے جرمن اور دیگر ممالک کے نوجوان سفارتکاروں کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

وہاں ایسے افراد سے دوستی ہوئی جو بعد ازاں اہم عہدوں پر فائز رہے اور میرے وزیر و سفیر بننے پر خوب مددگار ثابت ہوئے۔ جرمن خارجہ افسر متعدد فنکشن کا

انعقاد کراتا جب کہ وزیر خارجہ ہر سال بون کے بیتھوون ہال (BETHOWEN HALLE) میں بہت بڑے استقبالیہ کا اہتمام کرتے۔ جرمنی کی وفاقی ریاستوں کے نمائندہ افسران بون میں بیٹھتے اور ایف آر جی سے اپنے سفارت خانوں کو رابطے میں رکھتے۔ ان تمام سہولیات نے جرمن عوام کو بہترین شکل میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی وجہ سے میں نے دیگر ممالک کے سفارتکاروں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کی بجائے تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے جرمن افراد سے دوستی کی۔ اکثر کے ساتھ تو اس حد تک وابستگی ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کو پہلے نام (first name) سے ہی پکارتے تھے۔

Benelux ممالک بیلجیئم، ہالینڈ اور لکز مبرگ 100 کلومیٹر کے فاصلہ پر تھے۔ چھٹی کے دنوں میں سفارتکار اکثر ان ممالک میں سستی اشیا اور معیاری خوراک سے لطف اندوز ہونے جاتے۔ ایک سرد دن، برف سے ڈھکی سڑک پر میری کار پھسلی اور آگے جاتے ٹریکٹر سے ٹکرا گئی۔ دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ میں اور ٹریکٹر ڈرائیور باہر نکلے، ایک دوسرے سے ملے اور اس نے مجھے گاڑی آہستہ چلانے کی ہدایت کی۔ مجھے آج بھی اس کی نصیحت یاد ہے کیوں کہ اکثر حادثات تیز رفتاری کے باعث ہی پیش آتے ہیں۔

جرمنی میں مجھے ہدایت کی گئی کہ اگر آپ کا اشارہ سبز بھی ہو جائے تو بھی آپ دائیں اور بائیں دیکھ کر یقین دہانی کر لیں کہ کوئی گاڑی اشارے کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہی۔ حادثہ تو کسی اور کی غلطی کے باعث بھی ہو تو نقصان دہ ہی ہوتا ہے۔

تجارتی و اقتصادی تعلقات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سیاسی منظر نامہ میں بھی بھارت کی نسبت پاکستان، جرمنی کے زیادہ قریب تھا۔ پاکستان مشرقی جرمنی کو نظر انداز کر گیا جب کہ بھارت نے ان کے ساتھ تمام پلیٹ فارمز پر سفارتی تعلقات قائم کر لیے تھے۔ پاکستان نے مشرقی اور مغربی جرمنی کے الحاق کی بھی حمایت کی۔

دوسری جنگ عظیم میں شامل متعدد جرمن ابھی زندہ تھے۔ ان میں سے اہم

جنرل رومیل(ROMMEL) کے چیف آف سٹاف، جنرل ویسٹ فال تھے جنہیں ''صحرائی لومڑ'' (DESERT FOX) کے طور پر جانا جاتا تھا۔ جنرل ویسٹ فال اور ان کے خاندان سے میری دوستی ہوگئی۔ وہ صدر ایوب خان کو بہت سراہتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے باوجود جرمن اپنی بہادری اور کامیابیوں پر نازاں تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتامی دور میں جرمن فوج کی تعداد کم ہوگئی تھی اور امریکی پیش قدمی کو روکنے کے لیے وہ اپنے ٹینکوں کو چار گروہوں میں تقسیم کرتے اور امریکیوں کو چاروں طرف سے حملہ کرکے آگے بڑھنے سے روکتے۔

نورمبرگ(NUREMBERG) میں سزائیں اگرچہ میڈیا کا حصہ تو نہ تھیں مگر نجی و ادبی حلقوں میں ان پر مباحثہ ہوتا رہتا۔ امریکہ میں انٹرنیشنل لاء پر متعدد کتابیں جرمن جرنیلوں کی سزا کو جنگی جرائم اور انسانیت سوز واقعات کے باعث درست قرار دیتیں۔ جرمنی اور دیگر قانونی ماہرین کے نزدیک یہ سزائیں غیر قانونی تھیں۔ ماضی کے قوانین (Ex Post Facto) غیر قانونی قرار پاتے ہیں۔ جرمن جرنیلوں اور ہائی کمان کے عہدیداروں کے خلاف سزائیں فاتح کی جانب سے مفتوح پر فتح کا دھونس تھیں۔

جرمن اپنی نظم وضبط کی صلاحیت پر فخر کرتے ہیں۔ وہ کبھی خود کو سب سے زیادہ ذہین نہیں کہتے مگر منظم ہونے پر نازاں ہیں۔ میں وہاں تین تعیناتیوں اور گیارہ سال گزارنے کے بعد ان کے اس دعویٰ کی تائید کرتا ہوں۔ اس دوران پاکستان سے صدور، وزرائے اعظم، وزرائے خارجہ نے جرمنی کے دورے کیے تھے۔ جرمن دفتر خارجہ کی پروٹوکول ڈویژن اس قدر منظم تھی کہ ہمیں استقبالیہ، اہم شخصیات کے اوقاتِ کار اور ان سے برتاؤ کی فکر نہ ہوتی۔ اس کے برعکس اطالوی پروٹوکول ڈویژن کافی حد تک ہماری طرح تذبذب کا شکار ہی رہتی تھی۔ پاکستان کی طرح اطالوی پروٹوکول سے بھی مسلسل رابطے میں رہنا پڑتا تھا تاکہ پروگرام کا درست اطلاق ہوسکے۔

1965ء میں رَن آف کچھ کے بعد امریکی صدر جانسن نے نہ صرف پاکستان کو تمام قسم کی امداد روک دی بلکہ جرمن حکومت سے بھی ایسا کرنے کو کہا۔ جرمنی کا جواب

بہت جارح اور نفی میں تھا۔ جرمن حکومت نے اپنے جوابی خط میں کہا کہ حکومت نے جرمن الحاق کی مخالفت اور مشرقی جرمنی سے مکمل سفارتی تعلقات کے باوجود بھارت کی امداد تک نہیں روکی۔ انہوں نے امریکہ پر واضح کر دیا کہ پاکستان کی امداد جاری رہے گی۔ جرمنی کے امریکہ کو جوابی خط کی ایک کاپی ہمیں بھی موصول ہوئی تھی۔

ستمبر 1965ء میں بھارت کے خلاف جنگ کے دوران ہمیں پاکستان سے حکم موصول ہوا کہ وفاقی جمہوریہ جرمنی سے F86 جنگی طیاروں کے چار سکواڈرنز مانگے جائیں۔ پاک فضائیہ نے ان طیاروں سے بری فوج کی بھرپور مدد کی اور نہ صرف اس دوران بلکہ 1971ء میں بھی دشمن کے ٹھکانوں کو ہدف بنایا۔

اس وقت جرمنی میں پاکستان کے سفیر عبدالرحمان خان تھے جنہیں میں اپنے کیریئر کے دوران بہترین سفیر سمجھتا ہوں۔ وہ بہت حوصلہ منداور جلد گھل مل جانے والے تھے۔ اسی بنا پر وہ جلد ہی مختلف شعبوں سے وابستہ جرمن افراد کے دوست بن گئے۔

وہ صدر ایوب خان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ ان کی بیٹیاں اختر ایوب اور شوکت ایوب سے بیاہی تھیں۔ وہ پاکستان کے بہترین سفراء میں سے ایک تھے۔ ان کا بیلجئم سے مغربی جرمنی تبادلہ ہوا تھا۔ ہمارے پریس اتاشی خالد علی نے ذاتی فائدہ کی غرض سے ان کے اور اپنے ساتھیوں سے سفیر کی برائیاں شروع کر دیں اور انہیں کاغذی شیر کہا۔ اس طرح وہ سفیر کے پاس دوسرے افسران کی شکایتیں لگاتے رہے۔ ایک روز افسران کی میٹنگ کے دوران سفیر نے اپنے خلاف بیان بازی پر خفگی ظاہر کی۔ میں نے ان سے کہا کہ اس میں صداقت نہیں اور جس نے نجی طور پر آپ کو آپ کے ساتھیوں کے خلاف بھڑکایا ہے وہی آپ کی غیر موجودگی میں دوسروں سے آپ کی برائی کرتا ہے۔ انہیں میری بات پسند آئی اور کچھ عرصہ بعد مجھ سے اپنے گھر والوں کی طرح برتاؤ کرنے لگے۔ جب بھی وہ بون سے باہر کہیں جاتے مثلاً برلن، میونخ، ہینوور وغیرہ تو مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ وہ 1970ء میں میری شادی میں بھی شریک ہوئے۔ ان کے صاحبزادے ہمایوں اور جہانگیر میرے اچھے دوست تھے جن کے ساتھ میں ہری پور کے

پہاڑوں میں شکار کے لیے جاتا۔ بد قسمتی سے ہمایوں جواں سالی میں ہی ایبٹ آباد کے قریب کار حادثہ میں جاں بحق ہو گیا۔

جس پہلے شخص سے ہم نے رابطہ کیا وہ مغربی جرمنی کی فضائیہ کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل پینیٹزکی (PAINITZKI) تھے۔ ہمارے سفیر نے ان سے ملاقات کی درخواست کی مگر فضائیہ کے سربراہ نے کہا کہ وہ خود سفیر سے ملنے ان کے گھر 15 منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ انہوں نے پاکستان کو جنگی طیاروں کے چار سکوارڈرن 96 جہاز بشمول سپئیر پارٹس دینے کی ہامی بھری۔ پاکستان کو F86 کے چار سکوارڈرن کے ساتھ ایک کروڑ امریکی ڈالر مالیت کے سپئیر پارٹس بھی ملے۔ پاک فضائیہ کے بیڑے میں یہ سب سے بڑی جہازوں کے شامل ہونے کی تعداد تھی۔

یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ F86 امریکہ بناتا تھا۔ جن ممالک کے پاس یہ جنگی جہاز تھے انہیں کسی اور ملک کو دینے سے پہلے امریکہ کی اجازت درکار تھی۔

ہمیں شک تھا کہ امریکی خفیہ اداروں نے بون میں پاکستانی مشن پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے مجھے بذریعہ ٹیلی گرام پاکستان کو یہ اطلاع دینے کے لیے دی ہیگ جانا پڑا۔

عبدالرحمان خان کی جانب سے اپریل 1965ء میں جنرل وصال الدین کے اعزاز میں عشائیہ رکھا گیا (جس میں جنرل وصال الدین شریک نہ ہو سکے) اور اس میں لیفٹیننٹ جنرل پینیٹزکی بھی بطور مہمان شریک تھے، جنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پاکستان کو F86 طیاروں کے چار سکواڈرن کی پیشکش کر چکے تھے۔ انہوں نے یہ پیشکش ایئر مارشل اصغر خان کو کی تھی مگر اصغر خان نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ پاکستان کو امریکہ نئے F86 کے چار سکواڈرن دے گا۔ جنرل پینیٹزکی نے امریکی نیت پر شک بھی کیا تھا۔ بعد کے معاملات نے انہیں درست ثابت کیا۔

امریکی بینک برائے درآمدات و برآمدات نے پاکستان میں سٹیل مل کے قیام کے لیے سرمایہ دینے کی ہامی بھری۔ تاہم امریکہ نے 1965ء میں اس معاہدہ کو منسوخ

کر دیا۔ 1966ء میں ہمیں ہدایات موصول ہوئیں کہ جرمن حکومت سے پاکستان میں سٹیل مل کے قیام میں مدد کی درخواست کی جائے۔ ہم نے مغربی جرمنی کے اعلیٰ ترین حکام بشمول صدر Lubke، چانسلر پروفیسر لڈوگ ارہارڈ (جرمنی میں معاشی معجزات کے ماسٹر مائنڈ) اور چیئرمین ڈچ (DUTSCHE) بینک ڈائرکٹر ایبز (ABS) سے ملاقات کی۔ ان کا جواب انتہائی مثبت تھا۔ چانسلر ارہارڈ نے صدر ایوب خان کے نام ایک خط میں سٹیل مل کے قیام کی حامی بھری۔

جرمنی کے ہامی بھرتے ہی امریکہ چوکنا ہو گیا، اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ جرمنی کو ایسا کرنے سے روکنے کے لیے ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن ایم ایم احمد نے واشنگٹن ڈی سی روانگی کے دوران فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر سفری قیام کے موقع پر مجھ سے خدشہ کا اظہار کیا کہ پاکستان دو کرسیوں کے بیچ گر جائے گا اور بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا۔ کچھ دن بعد ہمیں وزیر خزانہ ایم شعیب کی جانب سے خفیہ ٹیلی گرام موصول ہوا جس میں ہدایت کی گئی کہ جرمن حکام کو بتایا جائے کہ ہمیں سٹیل مل کے لیے ان کی ضرورت نہیں کیوں کہ امریکہ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کی ہامی بھر لی ہے۔

سفیر عبدالرحمان خان اور میں جرمن ڈویلپمنٹ بینک کو پاکستانی حکومت کے فیصلہ کی اطلاع دینے فرینکفرٹ گئے۔ وہاں بورڈ کے رکن ڈاکٹر باچم (BACHEM) سے ملاقات ہوئی جو پاکستان سے معاملات کو دیکھتے تھے۔ ہم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی پیشکش لوٹائی اور بتایا کہ امریکہ اپنا وعدہ پورا کرنے کو تیار ہے۔

باچم نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جرمن حکومت پاکستان میں (STATE OF THE ART) بہترین قسم کی سٹیل مل مختصر دورانیہ میں قائم کرنے کے لیے تیار تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ کبھی بھی پاکستان میں سٹیل مل نہیں لگائے گا اور پاکستان کا فیصلہ احمقانہ اور بے وقوفانہ ہے۔ ان کی بات درست ثابت ہوئی اور امریکہ منحرف ہو گیا۔ امریکہ نے ایم شعیب کو نوازتے ہوئے عالمی بینک کا نائب صدر مقرر کر دیا۔

پاکستان پرانے امریکی M48 ٹینکوں کی تلاش میں بھی تھا جو اس سے بیشتر امریکہ سے ملے تھے۔ خاصی گفت وشنید کے بعد جرمنی نے پاکستان کو یہ ٹینک دینے کی ہامی بھر لی۔ صدر ایوب کی کابینہ میں وزیر غلام فاروق خان جرمن حکام سے اس معاملہ پر بات کرنے بون آئے۔ جرمن دفتر خارجہ کے سٹیٹ سیکریٹری لاھر (DR.LAHR) سے ملاقات میں غلام فاروق بہت بری طرح پیش آئے اور جرمنی کی پیشکش مسترد کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان سوویت یونین یا مشرقی یورپ سے نئے ٹینک لے لے گا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب 1966ء میں سوویت یونین کے توسط سے پاکستان اور بھارت میں تاشقند معاہدہ ہو چکا تھا۔

اس واقعہ سے مجھے لیفٹیننٹ جنرل (ر) گل حسن سے گفتگو یاد آ گئی جب وہ 1972ء میں آسٹریا میں سفیر مقرر ہوئے اور مجھے ان کے زیر تحت چند مہینے کام کرنے کا موقع ملا۔ گل حسن نے ایک واقعہ سنایا تھا جس میں روسیوں نے انہیں ٹینکوں کا وہ ماڈل تحفتہً دیا جو پاکستان نے روس سے منگوانے کا آرڈر دیا ہوا تھا۔ گل حسن نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اس دن کا منتظر ہوں جب پاکستان کو اصل ٹینک ملیں گے، جس کا انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ پاکستان کو وہ ٹینک کبھی نہیں ملے۔

جرمن حکام فیلڈ مارشل ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی قدر کرتے تھے۔ ایوب خان بہترین شخصیت، قائدانہ صلاحیت اور پاکستان کو معاشی استحکام پر گامزن جب کہ بھٹو ذہانت، خارجہ پالیسی پر گرفت اور خیالات کے عمدہ اظہار کے لیے جانے جاتے تھے۔ جرمن خواتین بھی صدر ایوب کو پسند کرتیں تھیں کیوں کہ وہ بہت دلکش شخصیت کے مالک تھے۔

ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ علامہ اقبال جرمن یونیورسٹیوں ہائیڈلبرگ اور میونخ میں زیر تعلیم رہے مگر اس کا علم نہیں تھا کہ وہ کہاں قیام پذیر رہے اور کہاں ڈگری حاصل کی۔ ہم نے ان کی قیام گاہ کی تلاش شروع کر دی۔ آج ہائیڈلبرگ میں اس گھر کے باہر ان کے نام کی تختی لگی ہے جہاں اقبال رہے۔ دریائے نیکر (NECKER) کے کنارے جہاں

وہ دورِ طالب علمی میں چہل قدمی کیا کرتے تھے، اب اس دریا کے اس کنارے کا نام Iqbal Ufer ہے۔ میونخ میں ان کی پی ایچ ڈی کا اصل تھیسس پاکستان بھجوایا گیا۔ میونخ سکوئر میں ان کے نام کی یادگاری تختی لگوائی گئی۔

ہم نے پاکستان پر تحقیق اور مطالعہ کے لیے یونیورسٹی آف ہائیڈلبرگ میں اقبال چیئر کے قیام کو یقینی بنایا۔ جب میں جرمنی کے لیے سفیر مقرر ہوا تو ہم نے وہاں ہر سال اہم شخصیات کو مدعو کر کے اقبال لیکچرز کا سسٹم قائم کیا۔ وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ نے اقبال پر پہلا لیکچر دیا۔

1965ء کے اوائل میں رَن آف کچھ کے بعد ظاہر ہو گیا تھا کہ پاکستان اور بھارت جنگ کی طرف جا رہے ہیں۔ جرمن حکام نے ہمیں بھارت سے جنگ نہ کرنے کی صلاح دی۔ ان کا موقف تھا کہ جرمنی کے ایک ہونے کا مطالبہ درست ہے مگر انہیں یہ احساس تھا کہ سوویت یونین کو شکست دے کر ملک کا کھویا ہوا حصہ واپس نہیں لیا جا سکتا۔

اسی طرح ان کا ماننا تھا کہ پاکستان کا کشمیر کے لیے مطالبہ برحق مگر ہمارے پاس اتنے دفاعی و معاشی وسائل نہیں کہ بھارت کو شکست دے سکیں۔ لہٰذا انہوں نے معاملہ نہ بگاڑنے کا مشورہ دیا۔ جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ پہلے میری ایمبیسڈر ایم ایوب سے برسلز میں ملاقات ہوئی جو اس وقت بلجیم میں سفیر تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ 1948-49ء میں پاکستان اور بھارت کے مابین کشمیر کے معاملات کے انچارج تھے۔ پاک و ہند کے درمیان جنگ بندی کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان نے پاکستان کو دھمکی دی تھی کہ اگر کشمیر میں جنگ جاری رہی تو ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار کر کے لاہور پر حملہ کر دے گا۔ بھٹو نے صدر ایوب کو یقین دلایا تھا کہ 1965ء میں ہندوستان سرحد عبور نہیں کرے گا۔ سفیر ایوب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے حکومت پاکستان کو 1949ء کے حالات سے مطلع کر دیا تھا۔ اگرچہ بھٹو نے صدر ایوب کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہیں کرے گا۔ ہندوستان نے اس کے خلاف سرحد عبور کرتے ہوئے لاہور پر حملہ کر دیا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا اور لاہور ہندوستان کے قبضہ میں جانے

سے بچ گیا۔

ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن سعید حسن 1965ء میں جرمنی آئے اور ایک میٹنگ میں جرمن حکام سے کراچی میں کانگریس سینٹر کے لیے معاشی امداد کی درخواست کی۔ جرمن امداد کی بجائے آسان اقساط پر قرضہ دینے کے لیے مان گئے۔ واپسی پر حسن نے ایوب خان کو غلط رپورٹ دی کہ جرمنی نے کانگرس سینٹر کے لیے امداد کی ہامی بھر لی ہے۔ انہوں نے میرے منٹس آف میٹنگ مانگے جو ان کی رپورٹ کے برعکس تھے۔ جب کیس تصدیق کے لیے جرمن حکام تک پہنچا تو انہوں نے میری بات کی توثیق کی۔

پاکستانی شہری روزگار کی تلاش میں برطانیہ کا رخ کرنے لگے۔ چند پاکستانی ڈوور (DOVER) سے واپس بھیج دیئے گئے۔ ان میں سے ایک جو ڈوور سے نکالا گیا تھا، ہمارے سفارت خانے پہنچا اور پاسپورٹ گمشدگی کی اطلاع دی۔ اس کی پاکستانی ہونے کی شناخت کرنے کے بعد ہم نے پاسپورٹ دے دیا۔ وہ ڈوور سے دوبارہ واپس بھیج دیا گیا۔ برطانوی امیگریشن حکام نے بون میں برطانوی سفیر کو اطلاع دی کہ پاکستانی سفارتخانے نے اس شخص کو نیا پاسپورٹ جاری کیا ہے۔ برطانوی سفیر نے پاکستانی سفیر عبدالرحمان خان کو فون کر کے شکایت کی کہ جس پاکستانی شہری کو ہم نے پاسپورٹ دیا ہے، وہ بغیر ویزہ کے برطانیہ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمارے سفیر برہم ہو گئے اور برطانوی سفیر سے کہا کہ عزت مآب آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ لارڈ کلائیو کو کس نے انڈیا کا ویزہ دیا تھا۔ برطانوی سفیر شرمندہ ہو گیا اور بات چیت وہیں ختم ہوئی۔

سردیوں کے ایک دن جب ہر شے برف پوش تھی، میں نے اپنے دفتر کی کھڑکی سے ایک شخص کو برف پر پھسلتے اور فرش پر اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ ہم اسے اٹھا کر سفارتخانے لے آئے اور چائے دی تا کہ اس کی طبیعت بحال ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ قانونی طور پر برسلز کے ایک کلب میں برسر روزگار تھا اور قانونی کاغذات بھی دکھائے۔ اس کا پاسپورٹ گم چکا تھا اور وہ برسلز سفارتخانے میں نئے پاسپورٹ کے لیے گیا تھا۔ جس وقت وہ شخص سفارتخانے پہنچا، ڈی جی امیگریشن پاکستان برسلز کے دورہ پر تھے اور

اس وقت فرسٹ سیکریٹری کے دفتر میں موجود تھے۔

نوکری کی قانونی سند دکھانے کے باوجود فرسٹ سیکریٹری نے اس پر اپنا پاسپورٹ ارادتاً غائب کرنے یا پھاڑنے کا الزام لگایا۔ فرسٹ سیکریٹری اور ڈی جی امیگریشن نے اسے پندرہ دن کی محدود مدت کا پاسپورٹ دیا جو صرف پاکستان واپسی کے لیے قابل استعمال تھا۔ اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ وہ برسلز میں قانونی طور پر برسرروزگار تھا، میں نے اسے پانچ سالہ معیاد کا نیا پاسپورٹ اور برسلز واپسی کے لیے کچھ رقم دی۔ برسلز میں فرسٹ سیکریٹری کو اس بات کا علم ہوگیا۔

اس پر فرسٹ سیکریٹری نذیر احمد بہت برہم ہوئے اور دفتر خارجہ پاکستان میں اور امیگریشن حکام کو لکھا کہ میں نے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی اور ڈی جی امیگریشن کی حکم عدولی کی ہے۔ انہوں نے بون میں فرسٹ سیکریٹری نیاز اے نائیک جوان کے چھوٹے بھائی بھی تھے، کو بھی میری کارروائی بارے میں آگاہ کیا۔ دفتر خارجہ نے مجھے جواب داخل کرنے کا کہا۔ میں نے جواب دیا کہ فرسٹ سیکریٹری نے محدود مدت کا پاسپورٹ دیتے ہوئے تمام ذمہ داری ہمسایہ ممالک میں پاکستانی مشن کے کندھوں پر ڈال دی۔ پاکستانیوں کو وطن واپس بھیجنے کے لیے سرکاری فنڈز موجود تھے۔ برسلز میں فرسٹ سیکریٹری کو چاہیے تھا کہ وہ اس شخص کو سرکاری خرچ پر پاکستان بھیجتے جہاں اس کے سفر پر آنے والا خرچ وصول کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک اور غلطی یہ کی کہ برسلز میں قانونی طور پر برسرروزگار ایک پاکستانی کو بے روزگار کر دیا جو پاکستان واپسی پر بے روزگاروں کی تعداد میں ایک اور اضافہ ہی ثابت ہوگا۔ پاکستان کو زرمبادلہ کی ضرورت ہے اور یہ پاکستانی اپنے ملک میں سرمایہ بھیج رہا تھا۔ یہ ایک بہیمانہ اقدام ہے کہ قانونی طور پر برسرروزگار شخص سے ایسا سلوک کرتے ہوئے اسے شدید سردی میں سڑک پر پھینک دیا جائے۔ دفتر خارجہ نے میرے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے برسلز میں فرسٹ سیکریٹری کا فیصلہ غلط قرار دیا۔

دسمبر 1965ء میں صدر ایوب خان دو روزہ دورہ پر بون آئے۔ صدر

(LUBKE) اور چانسلر لڈوگ ارہارڈ سے ملاقات کی۔ بھٹو بھی وفد کے ساتھ تھے۔ یہ ستمبر 1965ء کی جنگ کے بعد کا واقعہ ہے جس میں جرمنی نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ جنگ کے دوران ایک طیارہ سویڈن سے پاکستان اسلحہ لے کر آ رہا تھا جسے جرمن حکام نے فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر روک لیا۔ ہماری مداخلت پر طیارے کو پاکستان جانے دیا گیا۔

عبدالرحمان خان نے صدر ایوب کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ اس دوران جو گفتگو ہوئی اس سے صاف اندازہ ہو گیا کہ وزیر خارجہ بھٹو اور ایوب خان کی راہیں الگ ہونے والی ہیں۔ عبدالرحمان خان نے ایوب خان کی خاطر مدارت کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ مجھے ان کا رویہ پُر اخلاص لگا۔ پاکستان روانگی کے لیے جہاز میں جانے سے پہلے انہوں نے تمام میزبانوں سے ہاتھ ملایا لیکن جب میرے پاس آئے تو بہت گرم جوشی سے ملے اور بہترین تواضع پر میرا شکریہ ادا کیا۔

1966ء میں ایوب خان نے بھٹو کو اپنی کابینہ سے نکال دیا جس کی بنیادی وجہ پاک بھارت جنگ پر دونوں کے مابین اختلافات تھی۔ متعدد وجوہات کی بنا پر یہ جنگ بے نتیجہ رہی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ چھمب جوڑیاں، کشمیر میں فوجی کارروائی لیفٹیننٹ جنرل اختر ملک کے زیر سرپرستی جاری رہنی چاہیے تھی کیوں کہ یہ علاقہ فتح ہو سکتا تھا اور یہ وہی علاقہ تھا جہاں بھارت کو کشمیر میں زمینی داخلے کا راستہ ملتا تھا۔ ایسے حساس موقع پر یحییٰ خان کو کمان ملنے سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ جنگ کے دوران بھٹو نے مشرقی پاکستان سے بھی بھارت کے خلاف محاذ کھولنے کی تجویز دی۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ اگر بھارت وہاں جوابی کارروائی کرتا تو اس کا مناسب جواب دینے کے لیے بنگال میں فوجی دستے ناکافی تھے اور بنگالیوں کو یہ بات بھی ناگوار گزری کہ وہ عدم تحفظ کا شکار تھے۔

عبدالرحمان خان نے مجھے بتایا کہ ایوب خان کو امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے ذریعہ یہ معلوم ہوا ہے کہ بھٹو فوجی شکست کے ذریعے ایوب خان کو ہٹانا چاہتے تھے۔

ستمبر 1966ء میں بھٹو نے بون کا ذاتی دورہ کیا۔ ان کی بہن ممتاز کینسر کی

مریضہ اور دفاعی اتاشی بریگیڈیئر مصطفیٰ خان کی اہلیہ تھیں۔ سفارتخانے کا تمام عملہ اس ڈر سے بھٹو کے قریب نہ آیا کہ کہیں ہمارے سفیر جو ایوب خان کے رشتہ دار بھی تھے، ناراض نہ ہوں۔ لیکن میں ان کے ساتھ کھڑا ہوا۔ دفاعی اتاشی کے خاندان سے میرے اچھے مراسم تھے۔ میں نے بھٹو کو کھانے کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ اگلے روز انہوں نے خط کے ذریعے میرا شکریہ ادا کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مشن کے تمام افسران اور مشن کے ممبران نے خود کو بھٹو سے دُور رکھا۔

جنگ ختم ہوئی تو ہم نے جرمن حکام سے پاکستان میں ریلوے بوگیاں بنانے کے لیے مدد کی درخواست کی۔ جرمن حکام نے ہمیں ریلوے بوگیاں بنانے والی مشہور جرمن کمپنی Linke-Hofmann-Busch کے اشتراک سے اسلام آباد میں فیکٹری بنانے کے لیے 30 ملین ڈی ایم دیئے جو پاکستانی 3 کروڑ روپے بنتے تھے۔ فیکٹری مقررہ مدت میں قائم ہوئی اور پاکستان نے عالمی معیار کی ریلوے بوگیاں بنانا شروع کر دیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق کا منصوبہ

پلاننگ کمیشن کے سربراہ برائے اقتصادی امور ڈاکٹر محبوب الحق نے 1962ء میں پاکستان کے لیے اگلے 25 سال کا منصوبہ تیار کیا جس میں یہ تجویز دی گئی کہ زراعت کی جگہ صنعتوں پر سرمایہ کاری کی جائے۔ جرمنی میں پہلی تعیناتی کے دوران میں نے ڈاکٹر محبوب الحق کے منصوبہ کا تذکرہ اس وقت کے سفیر محمد ایوب سے کیا، جو اس سے پیشتر فنانس سیکریٹری اور گورنر سٹیٹ بینک رہ چکے تھے۔ میں نے کہا کہ زراعت اور صنعت میں سے کسی ایک کا انتخاب معنی نہیں رکھتا کیونکہ ہمارے وسائل مزید بہتر مقاصد کے لیے استعمال ہو سکتے تھے۔ اس طرح ہم وسائل کا ضیاع کریں گے۔ زراعت اور صنعت ایک دوسرے کو آگے لے کر جا سکتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں آبادی کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر محبوب الحق کی صنعت پر توجہ دینے کی تجویز اس حقیقت پر مبنی تھی کہ پاکستان کو غذائی امداد تو امریکی PL-480 پروگرام کے تحت آ رہی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ خوراک

تو امریکہ دے رہا ہے لہٰذا پاکستان کو زراعت کی بجائے صنعت پر پیسہ لگانا چاہیے۔ خوراک کے لیے سپر پاور پر انحصار خودکشی کے مترادف تھا۔ امریکہ جب اور جیسے چاہتا امداد روک لیتا۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ ایوب صاحب نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ،''جب تک دوسروں کو احمق بناتے رہو تب تک تو ٹھیک ہے، لیکن اگر خود کو الو بنانا شروع کر دو تو یہ خودکشی کے مترادف ہے۔''

جب محبوب الحق جرمنی کے دورہ پر آئے تو ہم نے انہیں اپنی تجویز واپس لینے پر راضی کر لیا۔

1965ء کی جنگ میں افغانستان کا مثبت کردار

ستمبر 1965ء کی جنگ کے دوران بھارت نے افغانستان کو ترغیب دی کہ وہ پاکستان کے شمال مغربی علاقوں پر حملہ کر دے۔ جب جنگ چھڑی تو میں بون میں سیکنڈ سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض نبھا رہا تھا۔ ان دنوں پاک افغان تعلقات بھی اتنے خوشگوار نہ تھے لیکن جرمنی میں افغان سفارتخانے کے افسران اور افغان سفیر سے میرے ذاتی تعلقات خاصے بہتر تھے۔

افغان سفیر نے مجھے اپنے دفتر چائے پر مدعو کیا۔ اس دوران انہوں نے انکشاف کیا کہ بھارت نے افغان حکام سے پاکستان پر حملہ کے لیے رابطہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں پٹھان اور افغانستان میں پشتون ایک ہی خون ہونے کے ناتے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ افغانستان ایسا نہیں کر سکتا کیوں کہ اس طرح دونوں جانب اپنے لوگوں کا ہی خون بہے گا۔

پاکستان کے خلاف ایسا کوئی بھی اقدام نہ کرنے پر میں نے افغان سفیر کا شکریہ ادا کیا۔ البتہ یہ وضاحت کی کہ پاکستانی شہری، چاہے وہ جہاں بھی رہتے ہوں، ہمارے لیے برابر ہیں اور ان کے جان و مال کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔

1965ء کی جنگ میں ترک باشندوں کے جذبات

ترکی نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ انڈیا کے مسلمانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ترکی کو نقد رقوم بھی عطیہ کیں۔ جرمن اور ترک کو اس بات کا ادراک تھا۔ جرمنی کے پاکستان سے اچھے سلوک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پہلی جنگ عظیم میں مسلمانوں نے ان کے اتحادی ترکی کا ساتھ دیا۔ 1965ء کی جنگ کے دوران اور بعد بھی جرمنی میں رہائش پذیر متعدد ترک ہمارے سفارتخانے آئے اور رقوم عطیہ کیں۔ پاکستان کے لیے ترک عوام کی محبت دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ اس وقت کے مسلمانوں کا احسان نہیں بھولے جنہوں نے برطانوی راج کے باوجود ترکی کا ساتھ دیا۔

ملکہ الزبتھ کا دورہ جرمنی

ملکہ الزبتھ دوم نے 1965ء میں جرمنی کا دورہ کیا۔ دولت مشترکہ کے رکن ممالک کی جانب سے ان کے استقبالیہ کا اہتمام ریڈآوٹ (REDOUTE)، بیڈ گوڈسبرگ میں کیا گیا۔ چوں کہ تمام سفارتخانوں کے عملہ کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے لیے کشادہ کمرا موجود نہیں تھا لہٰذا انہیں مختلف کمروں میں جگہ دی گئی۔ ہر ملک نے ایک شخص کو مارشل منتخب کیا تھا لیکن میں پاکستان اور یو کے دونوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ برطانوی حکام نے ہمیں کہا کہ ملکہ الزبتھ سے ملاقات کے دوران ہماری خواتین گھٹنے جھکا کر انکساری سے ملیں۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کرتے ہوئے برطانوی حکام پر واضح کیا کہ ہماری خواتین کسی کے آگے نہیں جھکیں گی کیوں کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی کے بھی آگے جھکنے کی ممانعت ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ملکہ سے نظریں جھکا کر بات کی جائے۔ میں نے سفارتخانے کے افسران بشمول سفیر کا ملکہ سے تعارف کرایا اور اس دوران مسلسل آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا رہا۔ آخر میں ملکہ نے مجھ سے چند ذاتی سوالات پوچھے۔ تقریب شروع ہونے سے قبل برطانوی سفارتخانے کی ایک خاتون اہلکار آئی اور کہا کہ میں ان سب کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ

میں نہیں وہ سب کو دہشت زدہ کر رہی تھی۔ تقریب کے اختتام پر کسی نے کہا اُس شام بون سے کوبلینز تک دریائے رائن شعلوں میں لپٹا ہوگا۔ برطانوی خاتون (جولیٹ میسن) نے مجھے دریائے رائن جانے سے منع کیا مبادا میں شعلوں میں جل جاؤں۔ میں نے جواب دیا کہ اگر میں تمہارے ساتھ جاؤں تو جل جاؤں گا۔ ہم ایک ہی وقت تقریب سے باہر نکلے اور دیکھا کہ ہماری گاڑیاں ایک ساتھ کھڑی ہیں۔ اس کے پاس منی مائنر اور میرے پاس واکس ویگن سیڈان تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہاری گاڑی کو دھکا دوں۔ میں نے جواب دیا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہاری گاڑی کو اپنی گاڑی کے بوٹ میں رکھ لوں۔ میری گاڑی اس کے پیچھے تھی جب اس نے اپنی گاڑی کی کھڑکی سے ایک کاغذ لہرایا جس پر لکھا تھا، ''برطانوی سفارتخانہ کے کلب آؤ۔'' ہم دونوں وہاں گئے مگر کلب بند تھا۔ بعدازاں ہم امریکی سفارتخانہ کے کلب چلے گئے اور پھر ہم میں اچھی دوستی ہو گئی۔ برطانوی سفارتخانے میں ایگزائل موٹرنگ کلب تھا جو وقتاً فوقتاً مختلف جگہوں کے لیے ڈرائیو کا اہتمام کرتا۔ میں اس کا رکن بن گیا اور جرمن باشندوں اور سفارتکاروں کے ساتھ ملک کے مختلف شہر دیکھے۔ جولیٹ صرف اچھی دوست ہی نہ تھی بلکہ وہ بہترین بین الاقوامی کھانے بھی بنالیتی تھی۔

پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اس کے بحری جہاز پہلے سے ہی پرانے اور اپنی مدت پوری کر چکے تھے۔ پی این ایس سی نے جرمن ایکسپورٹ کریڈٹس سے تین نئے جہاز درآمد کیے۔ جرمنی میں شپنگ ایجنٹ کے لیے ہم نے اعزازی کونسل جنرل مسٹر ہیلمز سے رابطہ کیا جو خود بھی جرمنی کی بڑی شپنگ کمپنیوں میں سے ایک کے مالک تھے۔ ان کا صاحبزادہ ہمارے ساتھ تکبر سے پیش آیا اور تقاضا کیا کہ پی این ایس سی جرمنی سے کمائی کا 6 فیصد انہیں بطور کمیشن ادا کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان شپنگ کا بھلا کر رہے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ جرمن ساؤتھ امریکن لائنز جو وسائل کے اعتبار سے ہیلمز سے بڑی تھی، 2 فیصد کمیشن پر ایجنٹ بننے کو تیار ہوگئی۔ اس کے بعد ہیلمز جونیئر نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کی پیشکش کم کمیشن پر ہی مان لی

جائے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

ایک روز فرینکفرٹ میں ہمارے اعزازی کونسل جنرل ڈاکٹر کراہنین (KRAHNEN) جو ایک بینکار تھے، کے دفتر سے خاتون سیکریٹری کا فون آیا کہ پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک کا ایک سینئر افیسر ساری رات شراب خانہ میں گزارنے کے بعد اپنا 1200 جرمن مارک کا بل ادا نہ کر سکا شراب خانہ کا مالک اور افسر یہ بل لے کر قونصلیٹ آ گیا۔ اس شخص نے پاکستانی افسر کا پاسپورٹ اور رقم (کل 200 مارک) بھی رکھ لی اور اس کو پاکستان جانے سے روک دیا۔ میں نے خاتون سے پوچھا کہ انہوں نے بل دیکھا تھا۔ انہوں نے بل کی تصدیق کی۔ میری درخواست پر انہوں نے شراب خانہ کے مالک سے براہِ راست بات کرنے دی۔ میں نے اسے کہا کہ پاکستانی افسر کو تم نے شراب میں کچھ ملا کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کر کے تم نے غیر قانونی فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کا قانونی طور پر یہ جواز نہیں بنتا تھا کہ وہ پاکستانی افسر کا پاسپورٹ اور رقم ہتھیا کر اسے سفر کرنے سے روکتا۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ کوئی شخص 1200 مارک کی شراب کیسے پی سکتا ہے اور اسے تنبیہ کی کہ یہ معاملہ پولیس تک جائے گا، ہرجانہ کا دعویٰ بھی کیا جائے گا اور بات میڈیا تک بھی پہنچے گی۔ درحقیقت ایسا ہوا کہ پاکستانی افسر چند عصمت فروش عورتوں کے جھانسے میں آ کر انہیں شراب کی دعوت دیتا رہا۔ شراب خانہ کا مالک جو کچھ دیر پہلے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا فوراً ہی منت سماجت پر آ گیا اور معافی مانگتے ہوئے کہا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے آئی ڈی بی پی کے افسر کو بھی آئندہ کسی شراب خانے جانے اور ایسی حرکات سے منع کیا۔ ساتھ ہی اسے پہلی دستیاب پرواز سے پاکستان روانگی کا کہا۔ بعد ازاں میں نے پاکستانی سفیر عبدالرحمٰن خان کو تمام رُوداد سنائی جس پر انہوں نے کہا کہ ہمیں پاکستانی حکام کو مطلع کرنا چاہیے کہ ان کا افسر کیا کرتا رہا۔ میرا جواب تھا کہ افسر تو پہلے ہی کافی بھگت چکا ہے، لہٰذا ہمیں معاملہ یہیں دبا دینا چاہیے۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔

1965ء کی جنگ کے بعد جرمن عوام نے متاثرین کے لیے امدادی سامان اور

رقم اکٹھی کرنا شروع کی۔ فرینکفرٹ میں ہمارے اعزازی کونسل جنرل ڈاکٹر کراہنین نے کچھ استعمال شدہ ملبوسات اکٹھے کیے جنہیں پی آئی اے نے بلا معاوضہ پاکستان پہنچایا۔ کونسل جنرل نے دفتر خارجہ اور صدر ایوب خان سے استعمال شدہ ملبوسات دینے کے بدلے خود کو اعزاز سے نوازنے کی درخواست کی۔ درحقیقت ان کپڑوں کو پاکستان پہنچانے کا کرایہ ان کی کل مالیت سے کہیں زیادہ تھا۔ دفتر خارجہ نے عبدالرحمان خان سے رائے مانگی۔ انہوں نے صدر ایوب کے نام خط میں ڈاکٹر کراہنین کو اعزاز دینے کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا:

''مرغی ایک آنے کا انڈہ دیتی ہے اور گھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ گھوڑی لاکھ روپے کا بچہ دیتی ہے مگر منہ سے اف تک نہیں کرتی۔''

ایک روز میں دفتر بیٹھا تھا کہ مجھے ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹ سروسز کے سینئر افسر کا وزٹنگ کارڈ موصول ہوا۔ میں نے اسے فوراً بلا لیا اور چائے پر مدعو کرتے ہوئے اس کے پاسپورٹ میں چند ممالک کے اندراج کا معمولی مسئلہ حل کرایا۔ اس نے بتایا کہ وہ دی ہیگ میں ہمارے سفارتخانے گیا تھا جہاں کونسلر سیکشن میں ایک کلرک نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ ایسا رویہ پاکستان میں ہماری غلط کفالت کا نتیجہ ہے کہ اگر میں پاکستان میں اس افسر کے دفتر داخل ہونا چاہتا تو اس کا قاصد ہی مجھے روک لیتا۔

رائن لینڈ میں بیڈ گوڈسبرگ میں بڑی تعداد میں وائٹ وائن کشید کی جاتی ہے۔ رائن لینڈ میلوں کے انعقاد اور جلوسوں کے لیے مشہور ہے۔ کسی خاص دن بیسیوں موسیقاروں کے جتھے سر لگاتے اور موسیقی بجاتے کلون، ڈسلڈ ورف اور دیگر شہروں سے گزرتے۔ ایسے میلوں میں ہر کوئی شریک ہو سکتا تھا۔ وائس چانسلر اور وزیر خارجہ گنشیر ایسے اجتماعات میں شرکت کے شیدائی تھے۔ میرے اکثر جرمن دوست شراب نوشی کرتے جب کہ میں سادہ مشروبات پر ہی اکتفا کرتا۔ وہ مجھ سے پوچھتے کہ میں بغیر نشہ کیے کیسے جھوم سکتا ہوں۔ میں انہیں جواب دیتا کہ میرے لیے خوبصورت جرمن خواتین کو دیکھنا ہی

کافی ہے۔

اگست 1966ء کو میں نے عبدالرحمان خان سے ڈنمارک، سویڈن، ناروے اور دیگر سکینڈے نیوئین ممالک گھومنے کے لیے دس یوم کی رخصت مانگی۔ انہیں یہ آئیڈیا بہت پسند آیا اور وہ بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ہم نے نارتھ سی تک کا سفر بذریعہ کار کیا اور کوپن ہیگن بذریعہ کشتی پہنچے۔ نیشنل شپنگ کارپوریشن کے ایجنٹ نے ہمیں کوپن ہیگن شہر دکھایا۔ وہ ہمیں بندرگاہ پر لے گیا جہاں ہاتھوں میں گٹار تھامے ایک نابینا شخص کا مجسمہ تھا۔ اس نے بتایا کہ شہریوں کا اعتقاد ہے کہ جس روز کوئی سولہ سالہ ڈینش دوشیزہ اس مجسمے کے پاس سے گزرے گی تو یہ مجسمہ گانے لگ جائے گا۔

کوپن ہیگن سے ہم سویڈن میں داخل ہوئے جہاں خوبصورت جھیلوں کے بیچ سڑک پر ہم سٹاک ہوم کی طرف گامزن تھے۔ سڑکوں پر رش تھا۔ تپش کے باعث اکثر سویڈش مرد و خواتین مختصر لباس میں تھے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ سٹاک ہوم جاتے پورا دن گزر جائے گا مگر جونہی ہم نے دیگر گاڑیوں کے ساتھ دوڑ لگائی تو غروبِ آفتاب سے بہت پہلے ہی منزل آ گئی۔ رات بسر کرنے کے لیے ایک ہوٹل پہنچے تو وہاں زور و شور سے کوئی محفل چل رہی تھی۔ مہمان اور بہروں، سب نے کالی ٹائیاں پہن رکھی تھیں جس کے باعث دونوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ یہ صورتِ حال واقعی بہت دلچسپ تھی۔ اگلی صبح ہم چند کلومیٹر دور سٹاک ہوم پہنچے۔ ہوٹل میں کمرا لیا اور دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہونے نکل پڑے۔ چند روز بعد ہم نے اوسلو کے لیے سفر کیا اور راستے میں سویڈن کی مشہور اوپسلا یونیورسٹی دیکھی۔ یونیورسٹی ریکٹر سے بھی ملاقات ہوئی جنھوں نے ہمیں کیمپس کا دورہ کرایا اور چائے پر مدعو کیا۔ اس کے بعد اوسلو کے لیے سفر شروع ہوا۔ راستے میں جھیل کنارے کرسلاڈ (KARLSTADT) میں ایک ریستوران میں انتہائی لذیز کھانا کھایا۔ شام گہری ہوئی تو ہم نے قریبی قصبہ آکشم میں قیام کیا۔ ہوٹل میں کمرا لینے کے بعد میں ملبوسات کی دکان پر گیا جہاں سے ہیرنگ بون کی اون سے بنی جیکٹ خریدی۔ دکان دار نے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ یہ سنتے ہی کہ میرا تعلق پاکستان

سے ہے اس نے کہا،"جارحیت پسند لوگ" کیوں کہ اس کے خیال میں پاکستان نے ستمبر 1965ء میں بھارت پر حملہ کیا تھا۔اس کی غلط فہمی دُور کرنے کی خاطر میں نے جنگ کی وجہ بتائی۔اگلے روز ہم اوسلو کی طرف بڑھے اور ایک ہوٹل پہنچے جو امریکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ناشتہ اس قدر لذیز ہوتا تھا کہ کوئی بھی شخص سارا دن ناشتہ کی میز پر ہی براجمان رہے۔ناشتہ سے دل نہ بھرتا تو سیاح پھل، روٹی، پنیر اور جو بھی ہاتھ لگتا اپنی جیبوں میں بھر لیتے۔اس وقت اوسلو قدرے چھوٹا شہر تھا جہاں بمشکل ہی کوئی پاکستانی نظر آتا۔ہم سیاحتی بس اور پی این ایس سی کے ایجنٹ کے ساتھ شہر گھومنے گئے۔ایک پرتعیش ریستوران پہنچے جو معروف سکی جمپ پر واقع تھا۔وہاں پہلی بار رینڈیئر کے گوشت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔اوسلو میں ہم مقامی شاہی باغ میں موجود سیاحوں کے ساتھ گھل مل گئے۔

جرمنی واپسی بذریعہ بحری جہاز ہوئی جو نوجوانوں سے بھرا ہوا تھا اور موسیقی، رقص وکھیل کھود ہمہ وقت مصروف تھے۔میں نے اس ماحول سے خوب لطف اندوز ہوا اور سوچا کہ ہمارے سفیر کے بھی یہی احساسات ہوں گے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں رسمی طور پر اعلیٰ نسل (بلیو بلڈ) کی حکمرانی ختم ہو چکی تھی۔اس کے باوجود بڑے خاندانوں سے وابستہ افراد عام لوگوں سے تمسخرانہ رویہ رکھتے۔ڈاکٹر برنڈ وون سیڈو کے والد کی دوسری جنگ عظیم میں تمام جائیداد مشرقی جرمنی رہ گئی اور وہ مغربی جرمنی ہجرت کر گئے۔سیڈو دیگر دو جرمن طلبا کے ساتھ اس گھر کے تہ خانہ میں رہتے جہاں میں قیام پذیر تھا۔ان کی منگنی شاہی خاندان کی ایک خوبصورت خاتون سے ہوئی۔مجھے منگنی کی تقریب میں مدعو کیا گیا جہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ وہاں صرف بلیو بلڈ سے تعلق رکھنے والے افراد موجود ہیں حالاں کہ کچھ خاصے مفلوک الحال دکھائی دے رہے تھے۔

ہمارے مالک مکان سفیر فرائیر ون رچتھوفن (fRIERVON RICHT THOFEN) تھے جن کا تعلق جرمنی کے انتہائی بااثر خاندان سے تھا۔ان کے انکل جرمن

فضائیہ میں پائلٹ اور پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں کے متعدد جہاز گرا چکے تھے۔ مکان کرایہ پر لینے سے قبل میں نے ان کی بہن، جو کرایہ کے لین دین کی ذمہ داری تھیں، سے درخواست کی کہ گھر چوں کہ تمام ضروریات سے آراستہ ہے لہٰذا وہ تمام اشیا کی فہرست بنا لیں۔ ان کا جواب تھا کہ اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ برتن و دیگر اشیا تو تب بھی خراب ہو سکتی تھیں اگر وہ خود یہاں رہائش پذیر ہوتے۔

برلن الگ تھلگ شہر اور سوویت افواج کے زیر قبضہ علاقوں سے ملحقہ تھا۔ مغربی جرمنی سے بذریعہ سڑک مشرقی جرمنی کا سفر کٹھن تھا۔ 1946ء میں برلن فتح کرنے کے بعد سوویت کی یادگاریں اس شہر میں میرے ہوتے بھی نصب تھیں۔ بدنام زمانہ دیوار برلن نے مشرقی و مغربی برلن کو تقسیم کر رکھا تھا۔ سڑکوں کے بیچوں بیچ پہرے داری کے لیے قائم مینار بھی نظر آتے تھے جن کا مقصد مشرقی جرمنی کے عوام کے مغربی جرمنی داخلہ پر نظر رکھنا تھا۔ بھاگنے کی کوشش کرتے افراد کو اکثر گولی ماردی جاتی تھی۔

میں سوچا کرتا تھا کہ یہ تشدد جاری رہے گا یا کسی دن روسی سپاہی اپنی یادگاروں سمیت غائب ہو جائیں گے۔ خوش قسمتی سے 1989ء میں ایسا ہی ہوا جب برلن کے دونوں جانب عوام نے بالآخر دیوار گرادی۔ چانسلر کوہل بہت ہوشیار تھے۔ انہوں نے اپنے دس نکاتی ایجنڈا کے ذریعے نہ صرف سوویت یونین کو مشرقی جرمنی چھوڑنے پر مجبور کر دیا بلکہ دوسری جنگ عظیم میں کھویا ہوا سارا علاقہ بھی واپس لے لیا۔ نیٹو طاقتوں کی مسلسل مخالفت کے باوجود یہ معجزہ ہو گیا۔

میونخ بابیر ہاؤس جہاں ہٹلر نے بغاوت کی کوشش کی تھی، لوگوں کی توجہ کا مرکز اور ہر وقت پر ہجوم رہتا۔ سڈول اور دراز قد جرمن خواتین ملازمین ایک ہی وقت میں ایک درجن بائیرنگ اٹھائے بغیر ہاؤس کے ماحول کو چار چاند لگا دیتیں۔

چوتھا باب

تنزانیہ۔سیاہ افریقہ
(موذی امراض کا گڑھ)

بون میں الوداعی تقریب کے دوران میری دارالسلام رخصتی سے قبل کسی نے ایک لطیفہ سنایا۔ایک جرمن صنعتکار جو افریقہ میں مشترکہ کاروبار کرتا تھا،اپنی فیکٹری کا دورہ کرنے وہاں گیا۔حاضری رجسٹر دیکھنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک شخص غیر حاضر تھا۔متعلقہ شخص سے معلوم ہوا کہ وہ شخص چھٹی پر تھا۔ظہرانہ کے بعد فیکٹری کا دورہ کرتے ہوئے وہ باغیچے میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک شخص درخت کے تنے پر سو رہا ہے۔پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جو چھٹی پر تھا۔

سکول و کالج میں جغرافیہ کی کتابوں میں افریقہ کو "سیاہ براعظم" لکھا جاتا کیوں کہ وہاں سیاہ فام لوگ بستے اور bilharzia اور Tse Tse مکھی سے پھیلنے والی بیماری sleeping sickness عام پائی جاتی تھی۔میں بون سے بذریعہ پیرس،ایتھنز اور کمپالا،دارالسلام پہنچا۔ایتھنز خوبصورت شہر ہے جہاں چند روز قیام کے دوران میں نے قدیم شاہکار دیکھے۔ایک جگہ میری ملاقات ایک گورے جوڑے سے ہوئی جنہوں نے بتایا کہ ان کا تعلق جنوبی افریقہ سے تھا جو اس وقت نسلی امتیاز (Apartheid) کا گڑھ

تھا۔ میں انہیں طنزاً ''اعلیٰ نسل'' کا لقب دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے لقب پر دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔

مجھے ایتھنز (ATHENS) رکنا پڑا کیوں کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک بشمول مصر نے 1967ء کی جنگ کے بعد جرمن ایئر لائنز LUFTHANZA کی پرواز پر پابندی عائد کردی تھی۔ جرمنی پر الزام تھا کہ اس نے 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کو اسلحہ بھیجا۔ خوش قسمتی سے مجھے سینا میں اینٹیبی (ENTEBBE) ایئرپورٹ کے لیے ایک سیٹ مل گئی۔ پرواز کے دوران یوگنڈا کا ایک سیاہ فام سرکاری افسر ملا جسے پاکستانی اور بھارتی نژاد سے نفرت تھی اور وہ مجھے بھی انہی میں سے ایک سمجھتا تھا جو یوگنڈا میں قیام پذیر تھے۔ اینٹیبی سے کمپالا تک میں نے فضائیہ کی ویگن میں سفر کیا۔ راستے میں ہم نے ایک سکھ کو ممنوع جگہ سے یوٹرن لیتے دیکھا۔ یوگنڈا کے باسی نے غصے سے کہا کہ اس شخص کی داڑھی مونڈ دینی چاہیے۔ کمپالا میں میرا ایک جرمن دوست تعینات تھا جس نے دارالسلام جاتے ہوئے کمپالا میں مجھ سے ملنے کا کہا۔ ہوٹل سپیک میں میرا کمرا بک تھا۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے پتا چلا ہوا کہ میرا سوٹ کیس کسی اور کے ساتھ تبدیل ہوگیا ہے۔ مجھے جلد ہی سوٹ کیس واپس مل گیا کیوں کہ اس میں پستول تھی اور دوسرا شخص اسے رکھنے کا خواہش مند نہیں ہوسکتا تھا۔

ہوٹل اور ریستوران میں مہمانوں کو بیروں سے سختی سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں ''رفیقی'' بلایا جاتا جس کا مطلب ''دوست'' تھا۔

جرمن دوست کے ساتھ میں نے جھیل وکٹوریہ پر کشتی رانی کی۔ پہلی بار مجھے افریقہ کے رہن سہن کا اندازہ ہوا۔ ان میں قربت بہت زیادہ تھی۔ روم کی طرح کمپالا بھی متعدد پہاڑیوں پر آباد ایک خوبصورت شہر تھا۔ سوشلسٹ حکومت نے ایشیائی باشندوں سے قریباً سب کچھ چھین لیا تھا اور وہ کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ دو روز بعد میں نے دارالسلام کے لیے ایسٹ افریقن ایئرویز پر سفر کیا۔ افریقی جنگلات اور جاں لیوا بیماریوں کا سوچ کر میں خوف زدہ ہوجاتا۔ جیسے ہی جہاز زمین پر اترا تو گمان ہوا

کہ پتا نہیں دارالسلام میں زندگی کیسی ہوگی۔ مشن نے میرے لیے اجپ موٹل (AGIP MOTEL) میں کمرے کا بندوبست کر رکھا تھا جو ایک یونانی خاندان کی ملکیت تھا۔ میں نے کمرے میں سوٹ کیس کھولا تو دیکھا کہ آدھے کپڑے راستے میں ہی چوری ہو چکے تھے۔ رات کافی ہو چکی تھی لہٰذا میں ریستوران پہنچا اور کھانے کی فہرست پر موٹے حروف میں لکھا Lobster Thermidor منگوایا۔ وہ واقعی لذیز تھا۔ دارالسلام کے حوالے سے میرے خدشات دور ہوئے اور میں نے اگلے دو سال خوب مزے میں گزارے۔

تنزانیہ متعدد افریقی تحاریک آزادی کا گڑھ تھا۔ اس کا فوجی ونگ دارالسلام میں بھی تھا جو افریقہ بھر بشمول جنوبی افریقہ، جنوبی روڈیشیا، موزمبیق اور جنوب مغربی افریقہ میں آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ اس تنظیم کے سربراہان کو ہر وقت نوآبادیاتی طاقتوں کے ہاتھوں قتل کا خدشہ رہتا۔ ان میں سے ایک بم دھماکہ میں ہلاک بھی ہوا۔ مصری نژاد ڈاکٹر محمد سمیع اس تنظیم کا سربراہ تھا۔

پاکستان اور بھارت سے تعلق رکھنے والے افراد تنزانیہ، مڈغاسکر اور مشرقی افریقہ کے دیگر علاقوں میں چار گروہوں اسماعیلی، اثنا عشرے شیعہ، بوہرہ اور سنی میں منقسم تھے۔ وہ ہر محاذ پر ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے جس کے باعث پاکستانی سفارتکاروں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتے۔ تمام گروہوں میں شدید اختلافات تھے جب کہ مقامی لوگ بھی انہیں ناپسند کرتے۔ ان پر دولت دوسرے ممالک منتقل کرنے کا الزام تھا۔ جواب میں پاکستانی و بھارتی نژاد بھی مقامی لوگوں سے نفرت اور انہیں ادنیٰ تصور کرتے۔ نیئریری (NYERERE) کی سوشلسٹ حکومت نے صنعتی یونٹ اور مکانات ضبط کر لیے تھے جب کہ ایشیائی لوگوں سے ان کا رویہ بھی قابل افسوس تھا۔ پرنس صدرالدین آغا خان نے دارالسلام کا دورہ کیا اور اسماعیلیوں کو درپیش مسائل کے حل کے لیے ہماری مدد طلب کی۔ انہوں نے اسماعیلیوں کو کینیڈا ہجرت کا کہا۔ اسماعیلیوں کے لیے ایسے ممالک میں جانا آسان تھا کیوں کہ ان کی اکثریت برطانیہ کے مشرقی افریقہ چھوڑنے سے پہلے ہی برطانوی پاسپورٹ حاصل کر چکی تھی۔ مسلم برادری تب بھی

خوشحال اور پاکستان ہائی کمیشن کی مدد کرتی تھی۔ 1968ء میں پاکستانی نیوی کے جہاز بابر نے تنزانیہ کا خیر سگالی دورہ کیا۔ مقامی مسلمانوں نے افسران اور دیگر عملہ کا گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے انہیں کھانے اور دیگر دعوتوں پر مدعو کیا۔

برطانیہ نے وہاں پاکستانی و بھارتی نژاد اور دیگر ممالک کے باشندوں کو مقامی افراد سے الگ علاقوں میں رکھنے کا نظام مرتب کیا تھا۔ دارالسلام میں جہاں ہمارا مشن تھا، شہر تین حصوں میں تقسیم تھا۔ سمندری علاقے خلیج اویسٹر بے (OYSTER BAY) اور سلور سینڈز صرف برطانوی و یورپی افراد کے مسکن تھے۔ شہر اور اس کے مضافات میں پاکستانی و بھارتی نژاد رہتے۔ اس سے آگے کے علاقے اور گاؤں مقامی افراد کے لیے وقف تھیں۔

ایک روز میں نے اجیپ موٹل کی لابی میں ایک برطانوی نوجوان کو چند یورپی لڑکیوں کو یہ کہتے سنا کہ ایشیائی (پاکستانی و بھارتی) باشندوں سے دُور رہنا کیوں کہ وہ چور ہوتے ہیں۔ میں نے سن لیا اور جواب میں کہا کہ اگر وہ چور ہیں تو برطانوی ڈکیت ہیں۔

ایک بار تنزانیہ میں ایسا جان لیوا حادثہ پیش آیا جس میں، میں بال بال بچا۔ دیگر ممالک کے سفارتکاروں کے ساتھ ہم شکار پر گئے۔ وہاں مقیم ایک یونانی نے ہمیں خبردار کیا کہ گاڑیوں سے باہر نہ نکلیں کیوں کہ جھاڑیاں بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔ وہاں شیر، تیندوے، لگڑ بگڑ، جنگلی بھینسے، کوبرا سانپ اور دیگر خطرناک آدم خور افریقی جانوروں کی موجودگی کا خدشہ تھا۔ اس مقام پر جہاں گزشتہ برس امریکی امن دستے کا ایک رضا کار غائب ہوا اور پھر کبھی نہ ملا، ہم اترے اور ہرن کے شکار کے لیے مناسب جگہ دیکھنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں باقی ساتھیوں سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا۔ تین گولیاں چلانے کے باوجود مجھے اپنے ساتھی مل نہ سکے۔ آدھا دن گزر چکا تھا اور بارش بھی زوروں پر تھی۔

ایک ہی سمت میں چلنے کی بجائے میں نے اس نیت سے نیم دائرے میں چلنا

شروع کر دیا کہ شاید چند کلومیٹر آگے کوئی گاؤں نظر آ جائے۔ فیصلہ کارگر ثابت ہوا اور مجھے وہ راستہ مل گیا جہاں میرے ساتھی پہلے سے میری تلاش میں تھے۔ ہم دوبارہ ملن پر بہت خوش تھے اور گاڑی میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔ جس مقام پر ہم دوبارہ ملے وہاں سے قریباً سو میٹر کے فاصلہ پر شیروں کا جھنڈ جا رہا تھا۔

صدر جولیس نیئریری نے تنزانیہ کی دیہاتی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اجاما (دیہاتی) سوشلزم نامی سسٹم کی بنیاد رکھی تھی۔ ہر شے بشمول چھوٹے کھلیان بھی پوری کمیونٹی کی اجتماعی ملکیت تھے۔ دیہات میں موجود وسائل استعمال کرتے ہوئے ہر ایک کی ضروریات کا خیال رکھا جاتا۔ تنزانیہ کے شہریوں کو صرف ایک گھر رکھنے کی اجازت تھی۔ اگر کسی کے پاس ایک سے زیادہ رہائش گاہ ہوتی تو وہ حکومت اس سے لے لیتی۔ چوں کہ زیادہ افریقیوں کے پاس ذاتی رہائش نہیں تھی، لہٰذا اس قانون کا اطلاق پاکستانی و بھارتی نژاد پر بھی ہوتا تھا۔ اسماعیلی، بوہرہ اور اثنا عشری اس قانون کا سب سے زیادہ شکار ہوئے۔ اگرچہ کوئی مسلمان ہو یا کوئی اور، سماجی، جنسی و اخلاقی قدریں سب کے لیے مشترک تھیں۔

تنزانیہ کی وزیرِ صحت لوسی لامک غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود سات بچوں کی ماں تھیں۔ ایسی خواتین کو عقل مند تصور کیا جاتا تھا جو بغیر شادی کیے ہی ماں بن جاتیں۔

چوری و ڈکیتی معمول تھا۔ جب میں تنزانیہ پہنچا تو ہائی کمشنر نے اکیلے ساحل پر چہل قدمی سے منع کیا۔ ان کا گھر ساتھ ہی تھا اس کے باوجود انہوں نے ہدایت کی کہ میں گاڑی پر ان کی طرف آؤں۔ اگرچہ انہوں نے ان سب ہدایات کی کوئی خاص وجہ نہ بتائی۔ ایک دن ان کے باورچی نے بتایا کہ دارالسلام آمد پر ہائی کمشنر اکیلے ہی ساحل پر چہل قدمی کے لیے نکل پڑے۔ وہاں مقامی ڈکیتوں نے انہیں نقدی، گھڑی اور قیمتی سامان سے محروم کر دیا۔ یہ واقعہ بتائے بغیر ہی وہ مجھے اس قسم کے حادثہ سے دُور رکھنا چاہتے تھے۔

1969ء میں ہائی کمشنر مرزا رشید احمد اپنے خاندان سمیت چھٹیاں گزارنے پاکستان گئے۔ میں کبھی کبھار رات میں ان کے گھر کا چکر لگا کر چوکیدار کی موجودگی کی یقین دہانی کر لیتا۔ ایک رات چوکیدار غائب تھا۔ اسے پکارنے پر وہ ایک درخت سے برآمد ہوا۔ اس نے بتایا کہ ایک خوفناک درندہ باغیچہ میں گھس آیا تھا جس سے بچنے کے لیے وہ درخت پر چڑھ گیا۔

ہمارے دفتر اور میرے فلیٹ میں کئی بار چور گھسے۔ بین الاقوامی لیبر آرگنائزیشن کا نمائندہ میرا ہمسایہ تھا۔ ایک رات اس کے گیراج میں کھڑی گاڑی کے چاروں پہیئے چوری ہو گئے اور گاڑی زمین پر پڑی تھی۔ قانون وضابطہ کی حالت اس قدر خراب تھی کہ تنزانیہ کے خوبصورت ساحل بھی غیر محفوظ ہو چکے تھے۔ مقامی چوروں نے ایک طریقہ یہ بھی ڈھونڈ نکالا تھا کہ وہ ساحل پر سیر کی غرض سے آئے افراد کی آنکھوں میں ریت پھینک کر ان کا سامان لے جاتے۔ سوئس سفارتخانے کے فرسٹ سیکریٹری اس خدشہ کے پیش نظر کہ ان کے کپڑے چوری ہو جائیں گے، تیراکی کا لباس پہنے ساحل پر جاتے۔ ایک دن ساحل سے واپسی پر انہیں معلوم ہوا کہ کسی نے ان کے گھر سے ہی کپڑوں کا صفایا کر دیا اور پہننے کے لیے ایک جوڑا تک نہ چھوڑا۔

دارالسلام میں ہائی کمشنر میرے ہمسایہ تھے۔ چونکہ میں غیر شادی شدہ تھا اس لیے زیادہ تر ان کی طرف ہی کھانا کھاتا۔ ہفتہ اور اتوار کو ناشتہ بھی انہی کے گھر سے آتا۔ جب بھی وہ تنزانیہ یا اس سے باہر موریشیس، مڈغاسکر اور زیمبیا جاتے تو مجھے ساتھ لے جاتے اور اپنی فیملی کے فرد کی طرح برتاؤ کرتے۔ میں نے آخری بار انہیں اکتوبر 1975ء میں بھٹو کے دورہ بخارسٹ (BUCHAREST) کے دوران دیکھا۔ بنگلہ دیش کے سفیر کی حیثیت سے وہ ایئر پورٹ پر بھٹو کے استقبال کو آئے۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا تو تیزی سے میرے پاس آئے اور گرم جوشی سے گلے لگایا۔

ایک روز انہوں نے انتہائی پریشانی میں مجھے فون کیا اور فوری ان کی رہائش گاہ پر آنے کا کہا۔ معاملے کی پڑتال کے لیے میں فوراً ان کے گھر پہنچا۔ انہوں نے بتایا کہ

اگلے روز دارالسلام میں خواتین کی بین الاقوامی تنظیم ملبوسات کی نمائش کا انعقاد کر رہی تھی جس میں بھارتی ہائی کمیشن نے چند خوب صورت خواتین کو کشمیری لباس میں شرکت کا کہا تھا۔ ہائی کمشنر کا موقف تھا کہ ہمیں تنزانیہ کے دفتر خارجہ سے بھارتی ہائی کمیشن کو اس اقدام سے روکنے کی درخواست کرنی چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم ایسا ہی کریں گے، بہرحال مجھے دفتر خارجہ سے کوئی مثبت قدم کی توقع نہیں۔ میں نے ہائی کمشنر کو مشورہ دیا کہ ان کی دو خوب صورت بیٹیاں کشمیری لباس پہنے شو میں شرکت کریں۔ وہ فوراً مان گئے۔ میرا بہت اچھا دوست جوشوا ماقوم (MAKOME) دارالسلام میں واحد افریقی تھا جو واحد انگریزی اخبار میں ملازمت کرتا۔ میں نے اس سے پاکستانی خواتین کو اخبار میں زیادہ جگہ دینے کی درخواست کی۔ وہ مان گیا۔ اخبار میں صرف پاکستانی خواتین کی تصاویر شائع ہوئیں۔ جوشوا نے بھارتی خواتین کی تصاویر کو نظر انداز کر دیا۔ میری توقع کے عین مطابق تنزانیہ کے دفتر خارجہ نے ہمارے احتجاج پر کوئی کارروائی نہ کی۔

چند روز بعد قریباً رات دو بجے میرے دروازے کی گھنٹی بجی۔ دروازے پر جوشوا اپنی منگیتر اور ایک اور خوبصورت افریقی لڑکی کے ساتھ تھا۔ جوشوا نے اندر داخل ہوئے کہا کہ چند روز قبل میں نے اسے استعمال کیا تھا لہٰذا آج رات وہ مجھ سے فائدہ اٹھائے گا۔ اس نے مے نوشی کی اجازت مانگی جو میں نے دے دی۔ اس نے کہا کہ دراصل وہ میرے اپارٹمنٹ میں مے نوشی کرنا چاہتا ہے اور مجھے کمپنی دینے کے لیے وہ اپنی کزن ساتھ لایا ہے۔

معاہدہ تاشقند کے بعد پاکستان اور سوویت یونین کے تعلقات میں قدرے گرم جوشی آئی تھی۔ غیر ممالک میں پاکستانی سفارت کاروں کو سوویت سے دوستی کی اجازت مل گئی۔ ایک روز میں نے سوویت سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری کو عشائیہ دیا۔ خوش گپیوں کے دوران ہم نے روسی فلموں، ڈراموں اور موسیقی کے اعلیٰ معیار کو سراہا۔ روسی فرسٹ سیکریٹری نے پوچھا کہ کیا میں نے کوئی روسی فلم دیکھی ہے۔ اس بات کا ادراک کیے بغیر کہ ڈاکٹر ژواگو (ZHIVAGO) روسی فلم نہیں بلکہ اس میں انقلابِ روس کے چند

حصے دکھائے گئے ہیں، میں نے کہا،''جی ہاں،ڈاکٹر ژواگو۔'' روسی فرسٹ سیکریٹری نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ نہیں وہ تو مغربی پراپیگنڈا تھا۔

تنزانیہ کے اہلکار حتیٰ کہ جو دفتر خارجہ میں بھی زیر ملازمت تھے، کم و پیش ہی نظر آتے۔ پروٹوکول چیف مسٹر حمیدی ہمیشہ غیر حاضر ہوتے حتیٰ کہ ملاقات کا وقت دے کر وہ غائب ہو جاتے۔ ملاقات کے وقت کا خیال رکھنے والے چند افراد میں سے ایک مسٹر مسلونی (MOSOLONI) تھے جو پاکستان میں زیر تعلیم رہے۔

تنزانیہ میں بوہرہ کمیونٹی خاصی تعداد میں تھی۔ وہ ہر سال اپنے قائد کو تنزانیہ مدعو کرتے۔ ان کی تنزانیہ آمد کے اخرجات بوہرہ برادری برداشت کرتی۔ انہیں بے شمار عطیات و تحائف دیئے جاتے۔ 1969ء کے اوائل میں انہیں تنزانیہ مدعو کیا گیا۔ غیر ملکی کرنسی میں ادائیگی پر پابندی کے باعث بوہرہ برادری نے قائد کے سفری اخراجات کے لیے غیر قانونی ذرائع سے رقم بھیجی۔ اس کے نتیجہ میں تنزانیہ کی حکومت نے انہیں ناپسندیدہ شخصیت قرار دیتے ہوئے ان کی تنزانیہ آمد پر پابندی عائد کر دی۔ بھارتی ہائی کمشنر نے مداخلت کی کوشش کی مگر کسی حکومتی اہلکار نے ان سے ملاقات نہ کی۔

مرزا رشید احمد اہم لوگوں کے لیے عشائیہ کا اہتمام کیا کرتے تھے جو تنزانیہ میں خراب صورتِ حال سے موافق نہ تھے۔ چند مہمان دعوت قبول کرنے کے باوجود شرکت نہ کر پاتے۔ ایک دن انہوں نے برونڈی کے سفیر کو مدعو کیا۔ مقررہ وقت گزر رہے دیر ہو گئی مگر وہ نہ آئے۔ میں نے سفیر کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سو رہے تھے۔ انہیں جگایا گیا اور میں نے درخواست کی کہ وہ کپڑے پہنیں اور فوری آ جائیں اور وہ آ گئے۔

نیروبی میں ہائی کمشنر آر آر نور پیرس کے دنوں سے اچھے دوست تھے۔ میں اس وقت پروبیشنر اور وہ فرسٹ سیکریٹری تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک دن کینیا کی کابینہ کے ایک وزیر کے لیے عشائیہ کا اہتمام کیا گیا مگر وہ نہ آئے۔ ایک گھنٹہ انتظار کے بعد ہائی کمشنر نے کابینہ وزیر کو فون کیا اور آنے کی درخواست کی کہ مہمان ان کے منتظر تھے۔ وزیر نے جواب دیا، عزت مآب مجھے بھوک نہیں ہے، لہٰذا میں نہیں آ سکتا۔

گیم پارکس

تنزانیہ کی ایک وجہ شہرت اس کے گیم پارکس جیسا کہ میکومی، لیک مانیرا، سرینگیٹی اور نگرونگرو کیرٹر (NGRO NGRO CRATER) تھے۔ لیک مانیرا دنیا میں وہ واحد مقام ہے جہاں شیر درختوں پر چڑھتے اور ان کے آخری تنے تک پہنچتے ہیں۔ لیک مانیرا کی سیر کے دوران میں نے گیم وارڈن کے ہمراہ اپنی گاڑی ایک درخت کے قریب لگائی جس پر شیر بیٹھے تھے۔ میں نے وارڈن سے پوچھا کہ میں باہر نکل کر ان کی تصاویر لے سکتا ہوں۔ وہ اس شرط پر راضی ہوا کہ میرا ایک پاؤں گاڑی سے باہر اور دوسرا اندر ہو گا۔ میں نے شیروں کی چند تصاویر لیں۔ نگرونگرو دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اس کے رکھوالے دعویٰ کرتے تھے کہ اگر سیاحوں نے چالیس ہزار سے زائد جانور نہ دیکھے تو وہ ٹکٹ کے پیسے واپس کر دیں گے۔ ان کا دعویٰ درست تھا۔ سیاح اپنی گاڑیوں میں بیٹھے رہتے اور میرے علم کے مطابق شیر، ہاتھی، گینڈے اور چیتے سمیت کبھی کسی جانور نے ان پر حملہ نہیں کیا۔

ماؤنٹ کلی منجارو اس پر مبنی فلم 'Snows of Kilimanjaro' جس میں گریگری پیک (GREGRY PECK) اور انگرڈ برگ مین جس نے دلکش کردار نبھائے، کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہوگئی۔ انڈونیشیا کے سفیر ریٹائرڈ جرنیل اور بہت دوستی پسند تھے۔ مجھ سمیت چند ہی سفارتکار تھے جنہیں ان کی رہائش گاہ پر ٹینس کھیلنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار انہوں نے ماؤنٹ کلی منجارو کی سیر کا منصوبہ بنایا۔ ان کا خیال تھا کہ پہاڑ کے بلند ترین مقام پر چڑھائی اور واپسی میں ایک دن لگتا ہے۔ لیکن جب انہیں پتا چلا کہ کل سفر ایک ہفتہ پر محیط ہے تو پروگرام منسوخ ہوگیا۔

جوشوا نے ایک بار تنزانیہ کے متمول خاندان سے متعارف کرایا جس کے کافی کے باغات تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر عشائیہ دیا جہاں میری ملاقات ان کی خوبصورت بیٹی سے ہوئی جو برطانوی یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ تھی۔ اس کا بھی افریقی ممالک میں سے کسی ملک کے سفیر سے بغیر شادی کے بچہ بھی تھا۔ میری اس سے دوبارہ

ملاقات قریباً سال بعد ایک جیولری شاپ پر ہوئی جو میرے اسماعیلی دوست عبدل حاجی کی ملکیت تھی۔ وہ قیمتی پتھروں، گھڑیوں اور زیورات کا کاروبار کرتا تھا۔ خلیج اویسٹر میں اس کا شاندار گھر تھا۔ میں نے خاتون سے پوچھا کہ وہ پورا سال کہاں غائب رہی۔ اس نے بتایا کہ وہ حمل کے باعث ہسپتال داخل تھی جہاں اس نے بیٹے کو جنم دیا۔ میں نے اس سے شادی کا پوچھا تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ مجھے لگا شاید اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ کچھ دن بعد جوشوا سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے کہا کہ وہ لڑکی احمق ہے جس نے بغیر شادی کے دوسرا بچہ پیدا کیا۔ جوشوا میری بات سن کر حیران ہوا اور کہا کہ وہ لڑکی نہیں تم احمق ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ لڑکی ہوشیار اور ذہین ہے جس نے بغیر شادی کے ہی دو بچے پیدا کر لیے۔

اگرچہ تنزانیہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی جو تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ کل آبادی کا ایک تہائی ہیں جب کہ باقی دو تہائی آبادی مساوی طور پر مسلمانوں اور دیگر غیر الہامی مذاہب کے ماننے والوں پر مبنی ہے۔ درحقیقت تنزانیہ کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل اور ان کی مقامی زبان کشواہلی میں عربی الفاظ کی بہتات تھی۔ میں نے ایک بار جوشوا سے پوچھا کہ یہ غیر الہامی مذاہب کے ماننے والے کون ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی بھی مذہب کے پیروکار نہیں اور صرف زندگی بسر کرنے کے لیے دنیاوی رسومات کی پیروی ہی کرتے ہیں۔ تنزانیہ کے پہلے نائب صدر رشیدی کواوا مسلمان تھے۔ انہوں نے مجھے عید میلاد النبی ﷺ کی محفل میں شرکت کی دعوت دی جس میں ہزاروں مقامی مسلمان شریک تھے۔ وہاں جوش و خروش کسی بھی اسلامی ملک سے کم نہ تھا۔ تقریب علی الصبح ختم ہوئی اور کافی بیچنے والوں نے ہر خواہش مند کی مشروب سے تواضع کی۔

زینزی بار (ZANZIBAR) کچھ سال پہلے ہی تانگانیکا کا حصہ بنا تھا۔ زینزی بار دنیا میں سب سے زیادہ لونگ کاشت کرتا ہے۔ یہ دارالسلام سے پچیس منٹ کی پرواز پر ہے۔ جیسے ہی کوئی زینزی بار کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے اسے ہر طرف لونگ کی خوشبو

چھائی محسوس ہوتی ہے۔ زینزی بار کے سلطان کی برطانیہ سے شکست کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ملکہ وکٹوریہ نے وہاں بمباری کے لیے برطانوی جنگی بیڑہ بھیجا اور حکم دیا کہ سلطان کو سر تسلیم خم کرنے کا کہا جائے۔ برطانوی افسران پر مشتمل کمان کے دوسرے حصے کو حکم تھا کہ اگر سلطان ہتھیار نہ پھینکے تو وہ وہاں بمباری کرتے ہی واپس آ جائیں۔ بمباری کے بعد سلطان نے برطانوی کمانڈنگ افسر سے مذاکرات کے لیے اپنا پیغام رساں بھیجا۔ کمانڈر نے اسے جواب دیا کہ ملکہ وکٹوریہ کا حکم ہے، زینزی بار پر قبضہ کرلیا جائے۔ پیغام رساں نے پوچھا کہ اگر ہم انکار کر دیں تو اگلا قدم کیا ہوگا جس پر کمانڈر نے کہا کہ وہ دوسرے حکم کی جانب بڑھے گا جو دراصل ملکہ وکٹوریہ کے حکم کے مطابق واپسی تھا۔ پیغام رساں کو غلط فہمی ہوئی کہ کمانڈر اس صورت میں پورے جزیرہ پر بمباری کرے گا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر سلطان نے ہتھیار پھینک دیئے اور ملکہ وکٹوریہ کی اطاعت قبول کر لی۔

دارالسلام سے ہمیں مڈغاسکر اور موریشیس کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔

ان دنوں موریشیس برطانیہ سے آزادی کی تیاری کر رہا تھا۔ وہاں کافی کشیدگی تھی کیوں کہ مسلمان پریشان تھے کہ بھارت سے وہاں آئے ہندو آبادی کا 52 فیصد اور برطانیہ کے جاتے ہی جزیرہ پر حکومت بنا سکتے تھے۔ ہندو لیڈر سر سیوو ساگر رام گولم کو عبدالرزاق محمد اور کچھ اور مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ مسلمانوں کی پارٹی مسلم لیگ کی سربراہی ابراہیم داؤد کر رہے تھے۔ مسلمان کل آبادی کا 17 فیصد جب کہ عیسائی 33 فیصد تھے۔ ہندو قیادت مسلمانوں اور عیسائیوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کو تیار تھے۔ دونوں گروہوں میں شدید تنازع اور پرتشدد واقعات ہو چکے تھے۔ میں عیسائیوں (CREOLES) کے سربراہ گیتن دواول (GAETAN DEWAL) سے ملا اور ہماری ملاقات خاصی مثبت رہی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مسلمان اور عیسائی ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔ اگر انہوں نے کشتی میں سوراخ کیے تو دونوں ہی ڈوب جائیں گے۔ انہوں نے اس امر سے اتفاق کیا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں دوستی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ خوش قسمتی سے دونوں قبیلوں نے دانائی سے

کام لیا اور معاملات حل ہو گئے۔ میں ذاتی طور پر عیسائی اکثریت کے علاقوں میں گیا تا کہ انہیں دوستی کی یقین دہانی کرائی جا سکے۔

مولانا شاہ احمد نورانی کے والد کے موریشیس میں کئی مرید تھے۔ موریشیس کی آزادی سے قبل سیاسی کشیدگی کے دوران شاہ احمد نورانی اپنے مریدوں کو سر سیوو ساگر رام گولم کی حمایت کا کہتے۔ موریشیس کے مسلمانوں نے صدر ایوب خان سے رابطہ کیا تا کہ نورانی کے خلاف ان کی حمایت حاصل کی جائے۔ موریشیس کے مسلمانوں کی جانب سے پاکستانی صدر کو اپیل کے جواب میں ایوب خان نے کہا، ''بظاہر یہ شخص ایک بدمعاش (CROOK) ہے، کیا ہم اسے موریشیس سے نکال نہیں سکتے۔'' ہمارے لیے کسی طرح بھی ایوب خان کی ہدایات پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔ علاوہ ازیں ہماری سوچ تھی کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ امن سے رہنا چاہیے کیوں کہ وہ اکثریت میں ہیں۔ مرزا رشید احمد اور میں نے سر سیوو ساگر رام گولم اور ان کے مسلمان و ہندو ساتھیوں سے اچھے تعلقات بنا لیے۔ ان سے ملاقاتیں مثبت رہیں جن سے مسلمانوں کو حوصلہ ملا۔

مڈغاسکر

فرانسیسی قبضہ سے قبل مڈغاسکر میں بادشاہت تھی۔ جس محل میں بادشاہ رہا کرتے تھے وہ لکڑی کا بنا تھا۔ محل کے مرکزی ہال میں چار کونوں میں چار کمرے تھے جو بادشاہ کی چار بیویوں کے لیے بنائے گئے۔ افریقہ میں تعمیری مقاصد کے لیے صرف لکڑی استعمال ہوتی تھی۔ اینٹوں اور پتھر کا استعمال ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ دیمک اکثر عمارتیں چاٹ گئی تھی۔ از راہ مزاح کہا جاتا تھا کہ بیشتر افریقی تہذیب دیمک کے معدہ میں دفن ہے۔

مڈغاسکر دنیا کا چوتھا بڑا جزیرہ اور بحر ہند میں واقع ہے۔ فرانسیسیوں نے 1906ء میں اس پر قبضہ کیا۔ اسی وجہ سے مڈغاسکر میں فرانسیسی معاشرت اور زبان رائج تھی۔ میں اور مرزا رشید احمد مڈغاسکر پہنچے۔ انتاناناریو جو پہلے تاناناریو کہلاتا تھا،

مڈغاسکر کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہونے کے باعث خوبصورت اور اس میں فرانسیسی فنِ تعمیر جھلکتا تھا۔ ہائی کمشنر کی تعیناتی کی تقریب رسم ورواج سے مختلف تھی۔ صدر سراناتا نے ہمیں گول میز پر بٹھایا اور ہائی کمشنر سے اپنی تقریر پڑھنے کو کہا۔ اس نے وقتاً فوقتاً ہی تقریر روکتے ہوئے مناسب جملے کہے جنہوں نے سراناتا کی تقریر کی جگہ لی۔

مڈغاسکر میں پاکستانی و بھارتی نژاد مسلمان خاصی تعداد اور معاشرے میں بہتر مقام رکھتے تھے۔ مڈغاسکر کا امیر ترین شخص اسماعیل برصغیر سے تعلق رکھتا اور ٹیکسٹائل کے کاروبار سے وابستہ تھا۔ یہاں بسنے والے پاکستانی و بھارتی اٹھارویں صدی میں خصوصاً گجرات سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان کی اکثریت ماجونگا میں رہائش پذیر تھی۔ فرانسیسی انسانی تعلقات کو بہتر سمجھتے ہوئے مقامی افراد سے گھل مل گئے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی پڑھا لکھا شخص جس کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ اچھے علاقہ میں گھر لے سکے، فرانسیسیوں کے ساتھ رہ سکتا تھا۔

ایک روز مڈغاسکر سے تعلق رکھنے والے برصغیر کے رہنے والوں کا بیس نفوس پر مشتمل گروہ دارالسلام میں پاکستانی پاسپورٹ کے حصول کے لیے آیا انہوں نے پاکستانی پاسپورٹ کے حصول کے لیے درخواست کی جب کہ ان کے پاس پہلے سے فرانسیسی شہریت تھی۔ میں نے انہیں انکار کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی کہ یہ لوگ پاکستانی نہ تھے اور نہ ہی کبھی پاکستان گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب 1947ء میں پاکستان بنا، انہوں نے پاکستانی بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے پاس انہیں پاکستانی پاسپورٹ نہ دینے کی کوئی دلیل نہ تھی۔ لہٰذا میں نے انہیں بیس پاسپورٹ جاری کر دیئے جس پر انہیں بہت خوشی ہوئی۔ مڈغاسکر واپسی پر وہ پاکستان کے اغراض و مقاصد آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے۔ قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے میں نے اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سمندر پار پاکستانیوں سے ایسا سلوک کریں جیسا اٹلی اور جرمنی کرتے ہیں۔ اٹلی کا آئین ان لوگوں کو اپنا شہری سمجھتا ہے جن کے آباؤ اجداد صدیوں پہلے دوسرے ممالک میں ہجرت کر گئے تھے۔ انہیں انتخابات میں شرکت، ووٹ، سرکاری ملازمت

سمیت وہ تمام حقوق ملتے ہیں جو عام اطالوی کو دستیاب ہیں۔ اسی طرح وہ جرمن جو دوسرے ممالک خصوصاً سوویت یونین میں رہائش پذیر تھے، ان سے ویسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا جرمن باشندوں سے ہوتا ہے۔

مڈغاسکر میں عجیب رسم تھی کہ سال کے کسی خاص دن لوگ قبرستان جاتے، رشتہ داروں کی قبریں کھود کر مردوں کو باہر نکالتے اور اس یقین کے ساتھ سارا دن جشن مناتے کہ مردہ بھی ان کی خوشیوں میں شریک ہے۔ شام کو وہ مردوں کو دوبارہ قبر میں اتارتے اور دائیں بائیں ہو کر اس انداز سے واپس بھاگتے کہ جیسے مردے کو پیغام دے رہے ہوں کہ وہ ان کا پیچھا نہ کرے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ٹیڑھا بھاگیں گے تو روحیں راستہ بھٹک جائیں گی اور ان کے پیچھے نہیں آسکیں گی۔

زیمبیا

مرزا رشید احمد اور میں امداد دینے زیمبیا گئے۔ صدر کینیتھ کاؤنڈا (KENNETH KAUNDA) سے ملاقات کے بعد ہم وکٹوریا آبشاریں دیکھنے لونگسٹن گئے۔ یہ زیمبیا اور روڈیشیا کے بارڈر پر دنیا کی سب سے بڑی آبشاریں ہیں۔ ہر سو پانی اور اس کی گرج عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ مقامی زبان میں ان آبشاروں کو موسی اوطونیا کہتے ہیں جس کا مطلب ''گرج دار دھواں'' ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ لونگسٹن نے یہ آبشاریں دریافت کی تھیں۔ میں نے مقامی گورنر سے اس کا ذکر کیا جو ہمیں یہاں کی سیر کرا رہا تھا۔ اس نے غصے سے کہا کہ وکٹوریہ فالز تو پہلے سے موجود تھیں، لونگسٹن تو بعد میں آیا۔

افریقہ میں برطانیہ کی تعلیمی پالیسی

انڈیا میں طلبا کی اکثریت وکالت کی تعلیم حاصل کرتی اور انگلینڈ میں بیرسٹر بننے جاتی۔ تعلیم مکمل کرتے ہی کچھ وکالت کا پیشہ اختیار کرتے۔ ان میں سے چند نے آزادی

کی تحریک میں حصہ لیا۔ انڈیا میں اس تجربہ کو مدنظر رکھتے ہوئے برطانوی سامراج نے افریقہ میں شعبہ وکالت کی حوصلہ شکنی کی۔ اس کی بجائے استاد کے پیشہ کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ جیسا کہ انڈیا میں قدآور قائدین مثلاً قائداعظم قانون دان تھے اسی طرح افریقہ میں آزادی کا علم بلند کرنے والوں میں شامل موالیمو، تنزانیہ کے جولیس نائریری اور زیمبیا کے کینیتھ کاؤنڈا اساتذہ تھے۔

عمرہ کی ادائیگی

دارالسلام میں بحیثیت فرسٹ سیکریٹری تعیناتی کے دوران ہی میں 1968ء میں دو مہینوں کی چھٹی پر پاکستان چلا گیا۔ میں نیروبی سے پی آئی اے پر سوار ہوا جس نے جدہ ٹھہرنا تھا۔ میرے ذہن میں عمرہ کی ادائیگی کا خیال آیا۔ جدہ ایئرپورٹ چھوٹا تھا۔ دو بدو ایئرپورٹ کے ایک کونے میں چائے پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک امیگریشن اور دوسرا کسٹمز افسر تھا۔ چوں کہ انہوں نے میری طرف دھیان نہیں دیا لہٰذا میں نے انہیں پاسپورٹ پر مہر لگانے اور سامان کی تلاشی کا کہا۔ جدہ چھوٹا اور خستہ حال شہر تھا۔ سفارتخانے نے میرے لیے ہوٹل کا انتظام کیا جس کا کمرا ایئرکنڈیشنڈ تھا۔ میں وہاں دو روز مقیم رہا۔ باہر اس قدر گرمی تھی کہ میرے لیے سفارتخانہ سے باہر بغیر پانی یا کوکا کولا پیئے سو میٹر تک چلنا بھی عذاب ہوتا۔ میں نے گاڑی کرائے پر لی اور عمرہ کے لیے مکہ چلا گیا۔ میرے ساتھ سفارتخانے کا ایک بنگالی افسر بھی تھا۔ یہ شہر بھی چھوٹا تھا جہاں پرانی عمارات تھیں۔ آج میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا اور اطمینان کا اظہار کرتا ہوں کہ میں نے خانہ کعبہ کو اس کی اصل حالت میں دیکھا۔ خانہ کعبہ کے گرد فرش کنکریوں کا تھا اور آج کے دور جیسا جدید پتھر نہیں لگا ہوا تھا۔ اس وقت قریباً 25 لوگ عمرہ ادا کر رہے تھے۔ حجراسود کو جب تک اور جتنا چاہو بوسا کر سکتے تھے۔ صفا اور مروہ دو چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ آبِ زم زم کو خود کنویں سے نکالنا پڑتا تھا۔

پانچواں باب

رنگون میں تبادلہ

شویداگون کے پگوڈا کا شہر ینگون، برما، میانمار

مجھے دارالسلام سے اچانک برما جانا پڑا۔ مجھے فوری برما پہنچنا تھا کیوں کہ وہاں سفیر حسن امام اور فرسٹ سیکریٹری نذیر احمد میں اختلافات پھوٹ پڑے جس پر آخرالذکر واپس دفتر خارجہ بلا لیا گیا۔ میری خواہش تھی کہ تعیناتی کے مرحلہ میں درکار وقت پاکستان گزرے اس لیے بارہ گھنٹوں کے اندر دارالسلام سے روانہ ہو گیا۔ جگہ جگہ رک کر دوستوں کو الوداع کہا۔ چینی سفیر کی جانب سے الوداعی ظہرانہ کے دوران میں مسلسل وقت دیکھتا رہا تا کہ تاخیر نہ ہو۔ اس صورت حال کو بھانپتے ہوئے چینی سفیر نے کہا کہ چینی باورچی خانے ہر قسم کی صورت حال میں تیزی سے کام کرتے ہیں۔ کھانا ایک گھنٹہ میں کھا لیا گیا۔

عموماً افسران گرم و مرطوب ممالک سے معتدل موسم کے حامل ممالک میں تعینات ہوتے ہیں۔ تنزانیہ کا موسم گرم اور مرطوب تھا اور میں توقع کر رہا تھا کہ یہاں پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کے بعد مجھے ایسے ملک میں تعینات کیا جائے گا جس کا موسم معتدل ہو لیکن میرا تبادلہ برما ہو گیا۔

میں نے یہ معاملہ دفتر خارجہ میں اٹھایا اور نیاز اے نائیک کی مدد بھی لی جن کے ماتحت میں نے اس وقت کام کیا جب وہ بون میں فرسٹ سیکریٹری تھے۔ ہم ایک دوسرے کا مزاج سمجھتے تھے۔ سرکاری جواب اور نیاز اے نائیک سے وصول کردہ معلومات سے مجھے حوصلہ ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ برما، پاکستان کا اہم ہمسایہ ہے جب کہ وہاں سفیر اور فرسٹ سیکریٹری کی لڑائی ہوئی جس وجہ سے فرسٹ سیکریٹری کو فوراً اسلام آباد طلب کرلیا گیا۔ میری سطح کے افسر کی ضرورت تھی اور وزارتِ خارجہ کے نزدیک میں رنگون تعیناتی کے لیے بہترین انتخاب تھا۔ مجھے یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ وزارت نے میری فائل پر لکھ دیا ہے کہ رنگون میں تعیناتی کا دورانیہ مکمل کرتے ہی مجھے اپنی مرضی کے مقام پر تعینات کیا جائے گا۔

نیاز اے نائیک کا خط

31-03-1969

ڈیر وحید،

جلدی میں لکھ رہا ہوں۔ چوں کہ ایف ایس اور اے ایف ایس دونوں شہر سے باہر ہیں، ان کی واپسی تک تمہارے کیس پر بات نہیں ہوسکی۔ اب میں نے اے ایف ایس سے اس پر تفصیلی بات کی ہے، جو جیسا کہ تمہیں علم ہے ایڈمنسٹریشن کے معاملات دیکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اب تک تمہیں آفیشل جواب بھی مل چکا ہوگا۔

اے ایف ایس نے مجھے بتایا کہ یہ ذومعنی محسوس ہوسکتا ہے کہ خصوصاً تمہاری اعلیٰ قابلیت اور شاندار ریکارڈ کے باعث تمہیں رنگون کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ رنگون کو ایک بے حد اچھے ہیڈ آف چانسری کی ضرورت ہے۔ تمام دستیاب پی ایف ایس افسران میں سے تمہارا ریکارڈ سب سے زیادہ شاندار تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم اچھے کام کی قیمت ادا کررہے ہو۔ رنگون ایمبسی برے حال میں ہے۔ نئے سفیر حسن انعام نسبتاً کمزور ہیں۔ ہماری وہاں ایمبسی میں بے حد بدعنوانی اور نااہلیت ہے، اور تمہیں کم و بیش جیسا کہ

امریکی کہتے ہیں "Trouble Shooter" کے طور پر بھیجا جائے گا۔

اے ایف ایس نے اس پر بار بار زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ تمہارے احساسات کی بڑی قدر کرتے ہیں لیکن اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ انہوں نے فائل پر تحریر کیا ہے کہ رنگون میں تمہاری تعیناتی کے بعد تمہیں تمہاری مرضی کی جگہ پر تعینات کیا جائے گا۔

یہ ہے صورتِ حال۔ اور میرا خیال ہے کہ اسے بدلنا مشکل ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری اس سلسلے میں مدد نہیں کر سکا۔

نیک تمناؤں کے ساتھ۔

مخلص،

نیاز اے نائیک

برما حقیقتاً بہت اہم ہمسایہ تھا کیوں کہ اس کی سرحدیں مشرقی پاکستان سے ملتی تھیں۔ قریباً ڈیڑھ لاکھ پاکستانی برما کے مختلف علاقوں مثلاً (MANDALAY, AKYAB, TAUNGI, PROME) وغیرہ میں رہائش پذیر تھے۔ نیوان کے برسر اقتدار آنے سے وہاں موجود پاکستانی کافی متاثر ہوئے تھے۔ رنگون میں فوج کا مکمل راج تھا تاہم قریباً آدھا برما خصوصاً رات کے وقت شان جیسے باغیوں کے کنٹرول میں رہتا۔ صبح کے وقت تمام باغی شہروں میں کام کرتے اور رات کو ریاست مخالف کارروائیوں میں مصروف ہو جاتے۔ برما یہاں کے قیمتی پتھروں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور تھا۔ یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ بہترین زیورات برما سے نکلتے مگر تھائی لینڈ میں دکھتے ہیں۔ رنگون شہر مکمل طور پر برما فوج جب کہ دکانیں اور کاروبار حکومتی کنٹرول میں تھا۔ ریستوران مالکان اپنی جگہوں پر اس خوف سے سرمایہ کاری نہ کرتے کہ کہیں ریاست انہیں ہتھیا نہ لے۔

برما کی اکثریت اردو بولتی یا سمجھتی تھی۔ مرکز، شمال اور جنوب کے علاقوں مثلاً مندالے یا تونگی میں اگر کوئی انگریزی نہ سمجھ پاتا تو اردو آخری حل ہوتی۔

برما کے پروٹوکول چیف یوبی اے ماؤنگ دوستی پسند اور اردو سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے مجھے ہوشیار کیا کہ برما حکام کے ساتھ ملاقات کے دوران میں اپنے ساتھیوں سے اردو میں بات نہ کروں کیوں کہ ہمارے ہم منصب سب کچھ جان جائیں گے اور کسی قسم کے تمسخرانگیز جملے پر برا بھی مان سکتے ہیں۔ ماؤنگ نے یہ بھی بتایا کہ اگر چہ برما فوجی افسران نچلے عہدے رکھتے تھے مگر اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دے رہے تھے لہٰذا ان کے احترام کا خیال رکھا جائے۔ برما فوج میں صرف ایک جرنیل نیوان، صدر مملکت بھی تھا۔ اس کے بعد دوسرا اہم ترین افسر ایک بریگیڈیئر تھا تاہم اسے لیفٹیننٹ جنرل تصور کیا جاتا۔ ایک کرنل، میجر جنرل کے برابر اور یہی حال باقی افسران کا تھا۔

صدر نیوان غیر متوقع مزاج کے مالک تھے۔ وہ دوستوں کے ساتھ گالف کھیلتے تھے اور یہ مشہور تھا کہ وہ اختلافات کی صورت میں بے قابو ہو کر ان پر گالف کلب سے تشدد کرتے۔

برما شام مادری (MATRIARCHAL) معاشرہ تھا جہاں خواتین قائدانہ کردار ادا کرتیں اور جائیداد بھی انہی کی ملکیت ہوتی۔ عام معاشروں میں بیوی اپنے شوہر کے گھر آتی ہے جب کہ برما میں اس کے برعکس تھا۔ یہ قصہ بھی عام ہے کہ ایک بار خواتین کی برابری کے حقوق کا وفد امریکہ سے برما آیا اور یہاں پہنچ کر اسے غلط جگہ آنے کا احساس ہوا۔

ہمارے سفیر حسن امام مشرقی پاکستان سے تھے۔ فرسٹ سیکریٹری اور ان کے مابین جھڑپ کو مدنظر رکھتے ہوئے سیکریٹری خارجہ ایس ایم یوسف نے مجھے اسلام آباد میں ہوشیار کیا تھا کہ ایسا واقعہ دوبارہ پیش نہ آئے۔ اگر سفیر کی جانب سے کوئی مسئلہ ہو تو سیکریٹری خارجہ کو اطلاع کی جائے۔ میں نے جرمنی سے اپنے لیے گاڑی منگوائی مگر وہ مقرر وقت تک نہ پہنچی۔ اسی دوران میں سٹاف کار استعمال کر رہا تھا۔ کسی کے غلط مشورہ پر سفیر نے مجھ سے گاڑی لے کر اپنی رہائش گاہ میں کھڑی کرا دی جو ضابطہ کی خلاف ورزی تھی۔ ہمارے درمیان اختلافات نے جنم لیا مگر سیکریٹری خارجہ کی نصیحت کے باعث میں

خاموش رہا۔ دفاعی اتاشی کرنل محمد اکبر نے مجھے اپنی پرانی گاڑی استعمال کے لیے دے دی۔ ایک شام تھرڈ سیکریٹری نے مجھے، دیگر افسران اور سفیر کو اپنی رہائش گاہ پر عشائیہ دیا۔ افسران عموماً سفیر سے پہلے پہنچتے ہیں تاہم میں نے ایسا نہ کیا۔ تھرڈ سیکریٹری کے گھر پہنچتے ہی میں نے سفیر کے علاوہ سب سے مصافحہ کیا۔ جب تک محفل رہی، میں نے سفیر سے بات نہ کی۔ گزشتہ جھگڑے کو مدنظر رکھتے ہوئے سفیر خوف زدہ ہو گئے۔ اگلی صبح حیران کن طور پر انہوں نے سٹاف کار میرے گھر پہنچا دی۔ بعد ازاں ہم دونوں بہت اچھے دوست بن گئے۔

ہمارا دفتر شہر کے وسط میں ایک خستہ حال عمارت میں بھارتی سفارتخانے کے ساتھ واقع تھا۔ ایک دن برما فوج کا سپاہی ہمارے سفارتخانے کے باہر کھڑا نیم برہنہ ایک سگریٹ فروش سے محوِ گفتگو تھا۔ میرے ساتھ کرنل اکبر تھے جنہیں شک ہوا کہ وہ شخص ہمارے سفارتخانے کی جاسوسی کر رہا تھا کیوں کہ برما کے سابق قائد یونو، جو اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل بھی رہ چکے تھے، فوجی حکومت سے بچنے کے لیے بھارت جا چکے تھے۔ میں نے ان کے شک کو غیر حقیقی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یونو پاکستان نہیں بھارت گئے تھے۔ نیم برہنہ فوجی اہلکار وہیں کھڑا اسمگل شدہ سگریٹوں اور دیگر سامان کا سودا کر رہا تھا۔ میں حسن امام کو ہمارا دفتر بھارتی سفارتخانے سے دور منتقل کرنے پر قائل نہ کر سکا۔ دیگر عمارات کا زیادہ کرایہ رکاوٹ بنا۔ کچھ عرصہ بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو میں نے ہمارے سفیر کو کہا کہ جس دن بھارتی سفارتخانے کے اہلکار ہمارے دفتر گھس آئے اور خفیہ معلومات چرا لیں تو مشن کے سربراہ کی حیثیت سے انہی کی شامت آئے گی۔ اس بات نے انہیں چونکا دیا اور وہ کسی دوسری عمارت میں دفتر لینے پر راضی ہو گئے۔ اس طرح ہم نے رنگون کے مضافات میں ایک نئی عمارت میں تین ہزار روپے ماہوار کرایہ پر دفتر منتقل کر لیا۔

رنگون آمد پر مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے سفیر نے فرسٹ سیکریٹری کی سرکاری رہائش گاہ دفاعی اتاشی کو دے دی ہے اور انہیں میری آمد کے بعد نئی جگہ ڈھونڈنے میں کئی

مہینے لگ گئے۔ اس دوران میں جرمنی کے تعمیر کردہ خوبصورت وشاندار انیا لیک ہوٹل میں رہا۔ یہ مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب میں واحد رہائشی تھا۔ برما حکومت نے امریکی ایئر لائن سے طیارہ کرائے پر لیا جس کے ساتھ اس کا عملہ بھی آیا۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرا۔ میری ان سے دوستی ہوگئی اور ان کے ذریعے برما ایئر لائن اور برما سول ایوی ایشن اتھارٹیز کے مینجنگ ڈائریکٹر سے بھی تعلقات استوار کر لیے۔

اگرچہ پی آئی اے، چٹا گانگ سے رنگون پرواز کرتی تھی مگر یہ معاملہ خطوط کے ذریعے طے پایا تھا اور دونوں ممالک کی حکومتوں میں کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ مجھے متعلقہ معاہدہ پر برما حکام کے دستخط کرانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اگرچہ برما حکام اس حوالے سے منفی تاثر رکھتے تھے تاہم امریکی ایئر لائن کے عملہ اور ایم ڈی برما ایئر لائن کے توسط سے میں معاہدہ کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ معاہدہ کے معاملات طے کرنے کے لیے ڈی جی سول ایوی ایشن مسٹر رؤف، مسٹر حنفی اور خورشید انور پر مشتمل وفد سرخرو ہو کر پاکستان لوٹا۔ وفد کے ممبران قلیل ڈیلی الاؤنس کے باعث ہوٹل کی بجائے میرے ساتھ رہے۔

حساس خطہ میں واقع ہمسایہ کی حیثیت سے برما میں متعدد معاملات کا خصوصی خیال رکھنا پڑتا۔ برما مشرقی پاکستان اور چین کے درمیان ہے۔ آسام اور بھارت کے ناگا، مشرقی پاکستان اور برما سے ہوتے ہوئے چین جاتے اور گوریلا تربیت اور ہتھیار لیتے۔ پاکستان ان ناگا کی پشت پناہی کرتا اور برما حکام بھی انہیں کچھ نہ کہتے۔ ہم نے رنگون سے ناگا کی حرکت پر نظر رکھی۔

سرحدیں ساتھ ہونے کے باعث بعض اوقات دونوں ممالک کی افواج میں سرحدی جھڑپیں ہو جاتیں۔ پیرٹ جزائر فساد کی جڑ تھے لیکن پاکستان نے ہمیشہ اعتدال پسندی سے کام لیا۔ برما کے ملٹری حکمران مجھے اکثر بلا کر مشترکہ سرحدوں پر مسائل کے حل کا کہتے۔ عام طور پر ہم پرامن طریقے سے یہ مسائل حل کرا لیتے۔

مارچ 1970ء میں حسن امام پر فالج کا حملہ (cerebral stroke) ہوا اور وہ کوما میں جانے کے کچھ روز بعد انتقال کر گئے۔ ان دنوں میں اپنی شادی کے سلسلہ میں

پاکستان تھا۔ خبر سنتے ہی مجھے چھٹیاں ختم کرتے ہوئے برما آنا پڑا اور نو ماہ تک عارضی طور پر ان کی جگہ ذمہ فرائض انجام دیئے۔ اکیاب میں مَیں پاکستان کا قونصلیٹ تھا جہاں میں بذریعہ پرواز گیا۔ جہاز میں مسافروں کے علاوہ مرغیاں اور بکریاں بھی تھیں۔ اکیاب مشرقی پاکستان کے قریب ہونے کے باعث پاکستان اور برما میں سمگلنگ کا مرکز بن چکا تھا۔ برما سے چھالیہ اور مویشی جب کہ مشرقی پاکستان سے ٹیکسٹائل، ادویات اور دیگر تیار شدہ مال سمگل ہوتا تھا۔

راؤ علی بہادر جو اکیاب میں کونسلر تھے، انہیں رنگون مشن میں تھرڈ سیکریٹری کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ وہ بہت ملنسار اور کلرک سے تھرڈ سیکریٹری کے عہدہ تک پہنچے تھے۔ ریاض پراچہ جنہیں 1970ء کے اواخر یا 1971ء میں بطور سفیر تعینات کیا گیا بہت محنت طلب تھے۔ اگرچہ میرے لیے ان کا سامنا خاصا آسان تھا تاہم راؤ بہادر کا ان کے ساتھ کافی مشکل وقت گزرا۔ پراچہ مجھے اور راؤ علی بہادر کو صبح ہی اپنے دفتر بلا لیتے اور متعدد واقعات سناتے رہتے۔ وہ ایک موضوع کو سمیٹنے سے پہلے ہی دیگر موضوعات پر گفتگو شروع کر دیتے اور پہلا مسئلہ حل ہوتے دفتری اوقات ختم ہو جاتے۔ اس کے بعد ہمارے پاس پورے دن کا کام سمیٹنے کے لیے ایک گھنٹہ بچتا۔ راؤ کا مقررہ کام کسی نہ کسی طرح رہ جاتا۔ ایک دن پراچہ نے مجھے کہا کہ راؤ کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہے کیوں کہ اس سے اہداف مکمل نہیں ہوتے۔ چوں کہ میں ان سے بے تکلف تھا، لہٰذا میں نے کہا کہ سر راؤ کی ناقص کارکردگی کے ذمہ دار آپ ہیں کیوں کہ آپ سے روزانہ طویل میٹنگ کے بعد راؤ کے پاس تمام کام سمیٹنے کے لیے صرف ایک گھنٹہ بچتا ہے۔

یونیورسٹی آف رنگون، پروم موڑ پر واقع میرے گھر سے کافی قریب تھی۔ کیمپس میں خواتین کا راج تھا۔ ٹخنوں تک لمبے بالوں والی حسینائیں جب اِنیا لیک سے گزرتیں تو ماحول مزید رومانوی ہو جاتا۔ صدر نیون (NAVIN) اختلاف کرنے والے کسی شخص کو معاف نہ کرتا۔ ایک روز طلبا نے اس کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔ برما فوج فوری طور پر وہاں پہنچی، یونیورسٹی پر حملہ کیا اور طلبا کے قائدین کو گرفتار کر لیا۔ باقی ماندہ طلبا و

طالبات کو گاڑیوں میں بٹھا کر ان کے گھروں کو جانے والے راستوں پر چھوڑ دیا۔

برما میں تمام اقتصادی سرگرمیوں پر حکومت مسلط تھی۔ دکانوں کے نام نہیں نمبر ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹا ریستوران قومیایا گیا۔ جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ ریٹائرڈ ڈی جی ہیلتھ کا تھا۔ وہ اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر تھیں۔ بعض دفعہ وہ مجھ سے مختلف اشیا کی کیٹلاگ کا تقاضا کرتے جس کا مقصد یہ دیکھنا ہوتا کہ دنیا میں ایسا کیا کیا موجود ہے جو ان کی پہنچ میں نہیں۔

برما میں مون سون چھے ماہ تک رہتا۔ بارش بہت شدت سے ہوتی۔ بارشوں کا آغاز عموماً اپریل سے ہوتا۔ بارشوں کے آغاز سے قبل برما کے عوام واٹر فیسٹیول مناتے۔ اس دوران جو بھی ان کے راستے میں آتا، اس پر پانی پھینکا جاتا۔ وہ سفارتکاروں کی گاڑیاں روکتے اور بڑے مہذب انداز میں ان پر تھوڑا سا پانی پھینکنے کی اجازت مانگتے۔

برما میں اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی۔ رنگون میں شویدا گون (SCHEVADAGON) کا پگوڈا، دنیا میں بدھ مذہب کا سب سے بڑا پگوڈا (PAGODA) ہے۔ اس میں بہت بڑی گھنٹی لگی ہے۔ روایت کے مطابق جو بھی یہ گھنٹی بجاتا ہے دوبارہ رنگون ضرور آتا ہے۔ میں متعدد بار پاکستان سے آنے والوں کے ساتھ یہاں آیا مگر کبھی وہ گھنٹی نہیں بجائی کیوں کہ میں دوبارہ کبھی برما نہیں آنا چاہتا تھا۔

ایک طرح سے سفارتکار بھی برما حکومت کے قیدی تھے۔ وہ برما کی وزارتِ داخلہ سے باقاعدہ اجازت نامہ لیے بغیر ملک نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ رنگون میں دفاعی اتاشی اور ڈھاکہ میں قائم خفیہ اداروں کا سیٹ اپ ناگا کی نقل و حرکت کی معلومات اکٹھی کرتا۔ ذرائع سے ملنے والی معلومات بسا اوقات غلط ہوتیں۔ اس حوالے سے رنگون میں سفارتخانہ کے تعلقات اور معلومات بہتر تھیں۔ آئی ایس آئی سے اسلام آباد میں میٹنگ کے دوران اعلیٰ عہدیداروں نے سفارتخانہ سے ملنے والی اطلاعات کی تعریف کی۔

برما حکومت نے پاکستان اور بھارت سے تعلق رکھنے والے شہریوں کی جائیداد قومیائی تو پاکستانی شہری مادرِ وطن ہجرت کر گئے۔ چوں کہ ان میں سے بیشتر کسمپرسی کی

حالت میں تھے اس لیے سفارتخانہ کو اپنے خرچ پر انہیں پاکستان بھیجنا پڑا۔ سفارتخانہ کی جانب سے برما حکام کو باور کرانے کی بھی کوشش کی گئی کہ ان افراد کی زندگیوں کو زیادہ مشکل نہ بنایا جائے۔

ہمارے سفیر عبدالرحمان خان نے بتایا تھا کہ مختلف ممالک پر تعیناتیوں کے دوران انہوں نے محسوس کیا تھا کہ افغانی، پاکستانی، بھارتی اور مشرقی پاکستانی ذاتی صفائی اور لباس کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ بات کس قدر حقیقت پر مبنی تھی، اس کا احساس مجھے رنگون میں ہوا۔ برما کے عوام غربت کے باوجود پاکستانی اور بھارتیوں کی نسبت زیادہ صفائی پسند تھے۔ اگر برما کے کسی باشندے کے پاس دو جوڑے ہی تھے تو بھی وہ غسل کے بعد صاف کپڑے پہنے گا اور دوسرا جوڑا صاف پہنتا تھا۔ اکثر پاکستانی و بھارتی تمام وسائل کے باوجود بھی میلے کپڑوں میں دکھائی دیتے تھے۔

برما میں سفارتخانہ ہی سنگاپور سے تعلقات کا ذمہ دار تھا۔ وزیراعظم لی کوان یوں کے زیرِ قیادت سنگاپور تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ جنہیں لگتا تھا کہ سنگاپور سے برطانوی بحریہ اور فوجی دستوں کے انخلا سے وہاں خوش حالی میں کمی واقع ہوگی، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ برطانیہ کے جانے سے سنگاپور کی معیشت کو رتی برابر فرق نہ پڑا۔ 1970ء میں سنگاپور معاشی خوش حالی کی جانب گامزن تھا۔ کاروباری سرگرمیاں اور لوگوں کا معیارِ زندگی امریکہ و مغربی ممالک سے کسی صورت کم نہ تھا۔ سنگاپور کاروباری، معاشی اور سیاحتی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ 1969ء میں مَیں سنگاپور گیا تو بون میں میرے مکان مالک فرایئر ون رچ تھوفن سنگاپور میں جرمنی کے سفیر تھے۔ وہ گالف کے شوقین تھے۔ ہم نے شدید گرم اور مرطوب دوپہر میں گالف کھیلی اور پھر ان کی رہائش گاہ پر ڈنر کیا۔ رنگون میں مشن کی جانب سے تجارتی مشن کے قیام کی متعدد تجاویز کے باوجود حکومت پاکستان، سنگاپور کی اہمیت کا ادراک نہ کر سکی۔

رنگون میں قومی دن کی تقریبات کے لیے غیر رسمی لباس ہی زیب تن کیا جاتا۔ برما میں نیپالی سفیر جو بعد ازاں وزیر خارجہ بنے، میرے گالف پارٹنر اور قریبی دوست

تھے۔ رنگون سے میری رخصتی پر انہوں نے مجھے ککری (خاص خنجر) کا تحفہ دیا جو ہر جگہ میرے ساتھ رہا اور آج بھی ہے۔ انہوں نے اپنے قومی دن کے لیے غیر رسمی لباس کی جگہ سیاہ ٹائی لگانے کا کہا۔ لباس کے حوالے سے ہدایت پڑھے بغیر، میں رنگین لباس پہنے تقریب میں پہنچا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں تقریب سے چلا گیا۔

1970ء میں بنکاک میں ایشین ہاکی چیمپئن شپ منعقد ہوئی۔ رنگون کے فرسٹ سیکریٹری کے ساتھ ساتھ میرے پاس سفیر کا اضافی چارج بھی تھا۔ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ بنکاک پہنچا اور ہم ہوٹل DUSITANI میں ٹھہرے۔ وہاں پاکستان سفارتخانہ پہنچے اور سفیر (ریٹائرڈ جرنیل) سے ملاقات کے دوران پاک بھارت ہاکی فائنل دیکھنے کی خواہش کی۔ بدقسمتی سے سفیر نے رنگون میں پاکستانی فرسٹ سیکریٹری کی کوئی پرواہ نہ کی۔ لہٰذا میری خواہش پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اتفاق سے ہوٹل واپسی پر میری ملاقات تقسیم ہند سے قبل مایہ ناز ہاکی پلیئر اے آئی ایس دارا سے ہوگئی۔ نوعمری میں ہی دارا نے 1936ء کی برلن اولمپکس میں شرکت کی اور عمدہ کارکردگی سے خوب پذیرائی حاصل کی تھی۔ وہ مجھے پہلے سے ہی جانتے تھے، لہٰذا دوڑتے ہوئے میری طرف آئے اور ہاکی میچ دیکھنے کے لیے مدعو کیا۔ انہوں نے ہمیں وی وی آئی پی انکلوژر میں جگہ دلائی جب کہ سفیر اور ان کے ساتھی عام انکلوژر میں بیٹھے تھے۔ دونوں ٹیموں کے درمیان سنسنی خیز میچ ہوا۔ پاکستان کی نسبت بھارتی کھلاڑی زیادہ عمر کے تھے۔ سٹیڈیم میں پاکستانی تماشائیوں کے مقابلہ میں ہندو اور سکھوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ ہندو تماشائی نعرہ لگا رہے تھے کہ آج بھارتی ٹیم جیتے گی اندرا گاندھی کی جے ہوگی۔ دونوں ہاف میں کوئی ٹیم گول نہ کر سکی۔ اضافی وقت میں نوجوان پاکستانی ٹیم چھائی رہی اور دو گول کیے۔ جیسے ہی پہلا گول ہوا، ہندو تماشائی سکتے میں چلے گئے جب کہ پاکستانی شائقین کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

رنگون سے سنگاپور پہنچنے کے لیے بنکاک سے جہاز بدلنا ضروری تھا۔ بنکاک تھائی ریشم کے لیے مشہور تھا لہٰذا اب میں پاکستان میں موجود اپنی منگیتر کے لیے ریشمی کپڑا

خریدنے شہر نکل پڑا۔جس دکان سے میں نے کپڑا خریدا اس کی مالکن مسلمان تھی جس نے بتایا کہ تھائی ریشم کا زیادہ تر کاروبار جنوبی خطے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ایک پری چہرہ خاتون نے مجھ سے قومیت پوچھی اور یہ جان کر کہ میں پاکستان سے ہوں اس نے کہا، اوہ تم مسلمان ہو۔اس نے بتایا کہ وہ بھی مسلمان ہے۔وہ کہنے لگی کہ آپ بہت خوش شکل ہیں اور کاروباری اوقات کے بعد ڈنر کی دعوت بھی دی۔ میں نے جواب دیا کہ میرے لیے اس کے ساتھ ڈنر باعث خوشی ہوگا مگر مجھے رنگون کے لیے روانہ ہونا تھا۔

برصغیر کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر رنگون میں دفن ہیں۔برطانیہ نے انہیں برما جب کہ برما کے آخری بادشاہ کو انڈیا جلاوطن کر دیا تھا۔بہادر شاہ کے مزار پر ایک شعر درج ہے جو نہ صرف ان کا بلکہ تمام انسانیت کا مقدر بیان کرتا ہے:

کتنا ہے بدنصیب ظفر، دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

ان کا مقبرہ، درگاہ کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔برما میں مقیم پاکستانی سفیر نے کئی سال بعد ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کو بتایا کہ بہادر شاہ ظفر کا مزار بڑی خستہ حالت میں ہے۔ڈاکٹر صاحب نے ایک لاکھ ڈالر کی رقم اکٹھی کی اور مزار کی مرمت کے لیے پاکستانی سفیر کو بھیجی۔

چھٹا باب

ویانا۔ سلطنت ہیپسبرگ کا قدیم دارالحکومت

مارچ 1971ء میں مجھے برما سے میری مرضی کے مطابق ویانا تعینات کیا گیا۔ سفر کے دوران جب میں ڈھاکہ پہنچا تو مشرقی پاکستان کو علیحدگی کے دہانے پر دیکھ کر سکتہ میں آ گیا۔ تمام سائن بورڈ اور گلیوں کے نام بنگالی زبان میں تھے۔ انگریزی لکھائی مٹ چکی تھی۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افراد گھر سے نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

وزارتِ خارجہ رنگون تعیناتی پر ہی مجھے اگلی منزل کے انتخاب کا اختیار دے چکی تھی لہٰذا میں نے ویانا تبادلہ کو ترجیح دی۔ وہاں تعیناتی پر گفت وشنید تو کافی عرصہ سے چل رہی تھی تاہم مجھے دو ماہ بعد تعیناتی کا حکم نامہ موصول ہوا۔ اسی اثنا میں یہ خبر ویانا پہنچ چکی تھی۔ وہاں تعینات سفیر انور مراد نے مجھے عجیب خط لکھا جس میں شکایت کی گئی کہ میری سطح کے افسر نے انہیں بذریعہ خط تعیناتی کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ میں نے جواب میں لکھا کہ رسمی تعیناتی سے قبل میں انہیں کوئی اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔

میرا ساتھی اور ہم جماعت افضال قادر ویانا میں دو سال کام کر چکا تھا اور اس عرصہ میں انور مراد نے اس کی سالانہ کارکردگی رپورٹ بہت بری بنائی تھی۔ خط ملتے ہی میں نے افضال سے مراد کے بارے میں دریافت کیا۔ افضال نے غلط بیانی سے کام

لیتے ہوئے مجھے کہا کہ انور مراد دل کا بہت اچھا ہے جب کہ وہ اس کے برعکس تھا۔ اگر وہ سچ بولتا تو مجھے ویانا میں اذیت ناک سال نہ گزارنا پڑتا۔

ویانا میں دورانیہ بہت مشکل رہا کیوں کہ ہمارے سفیر کو اپنے ماتحتوں سے ادنیٰ درجہ کے انسانوں جیسا سلوک کرنے کی عادت تھی۔ سفارتخانہ تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں تھا۔ انور مراد جب بھی دفتر پہنچتے، وہ بھول جاتے کہ اخلاقیات کیا ہوتی ہیں۔ ان کا سیکنڈ سیکریٹری رشید احمد (بنگالی) سے رویہ اس قدر بہیمانہ تھا کہ وہ سقوطِ ڈھاکہ سے بہت عرصہ قبل ہمیں چھوڑ گیا۔ اس سے پیشتر رشید سیکریٹری خارجہ سے شکایت کر چکا تھا مگر بے سود رہی۔ مجھے پتا چلا کہ ایک اور بنگالی افسر انور مراد کے ہاتھوں ذلت اٹھا کر مستعفی ہو چکا تھا۔

دراصل انور مراد ان اشخاص میں شامل تھا جن کے رویہ نے بنگالیوں کو پنجابیوں سے متنفر کیا۔ انور مراد کی سیکریٹری خارجہ ایس ایم خان سے دوستی تھی جسے وہ بین الاقوامی سہولت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سفارتی بستے میں شکار کے لیے استعمال ہونے والے کارتوس اور چیکوسلواکیہ سے کرسٹل منگوا کر بھیجتا تھا۔ ہم دونوں میں تعلقات اس قدر بگڑ گئے کہ میں شاذ و نادر ہی سفیر کے دفتر میں جاتا۔ میں صرف اس کے بلانے پر دفتر جاتا اور بیٹھنے کی پیشکش کے باوجود کھڑا رہتا۔

اس حوالے سے میں نے جنیوا میں پاکستانی سفیر نیاز اے نائیک سے بات کی۔ انہوں نے ڈی جی ایڈمنسٹریشن برجیس حسن خان کو مطلع کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے انہیں بذریعہ خط ہمارے سفیر کے نامناسب رویہ کی شکایت کی۔ خط میں، میں نے انہیں ''مائی ڈیئر برجیس بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ انہوں نے یہ خط سیکریٹری خارجہ ایس ایم خان کو پیش کیا جس کی انور مراد سے اچھی دوستی تھی۔ ایس ایم خان نے اس خط پر میرے خلاف انتہائی سخت الفاظ لکھے اور حکم دیا کہ اسے میری فائل میں لگا دیا جائے۔ چوں کہ یہ ذاتی خط تھا، لہٰذا برجیس نے اسے فائل میں نہ لگایا اور ضائع کر دیا۔ سیکریٹری خارجہ کے دفتر میں BATCH-MATE احمد کمال ڈائریکٹر تھا جس نے وہ خط خوب تلاش

لاہور 1954ء ۔ بٹالہ انجینئرنگ کمپنی کا دورہ کرتے ہوئے
چینی وزیرِ اعظم چو این لائی کے ساتھ سی ایم لطیف
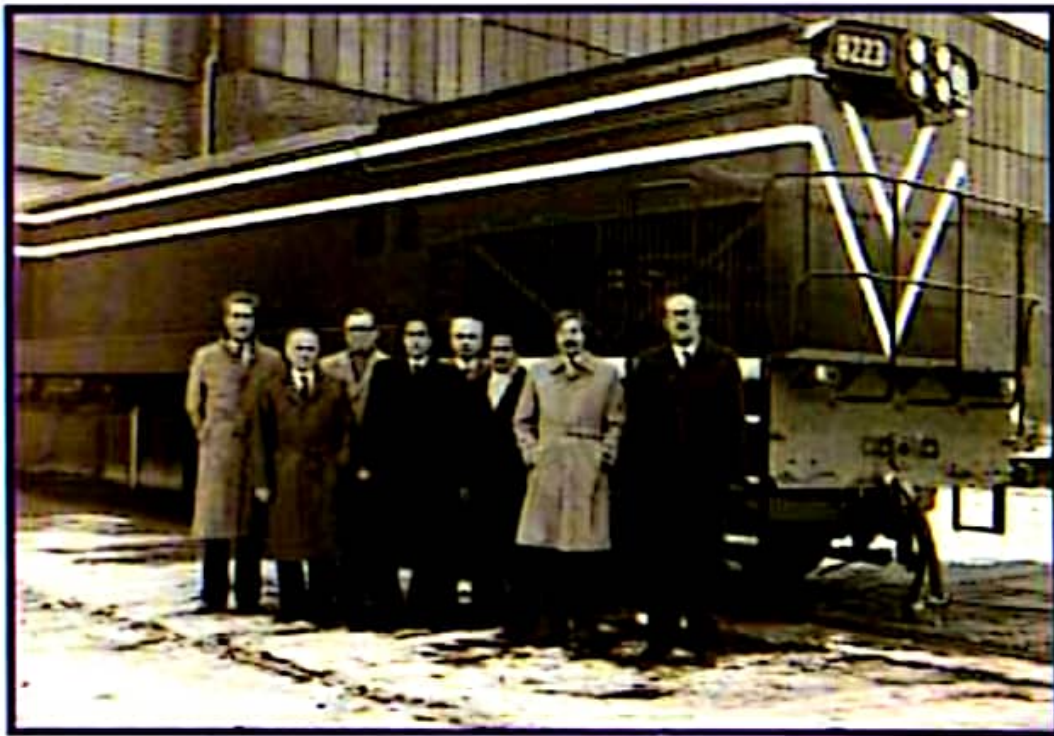
جرمنی 1985ء ۔ ہینشل لوکوموٹو کے ساتھ

بون 1966ء ۔ اے کے ایم شمس الضحیٰ اور دیگر کے ہمراہ

1987ء۔ آخن یونیورسٹی جرمنی میں پاکستان موہنجوداڑو نمائش کے 40 سال

ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں پاکستان پر لیکچر

آخن یونیورسٹی میں موہنجوداڑو پر نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے

نواب اکبر بگٹی ایک وفادار اور محب وطن پاکستانی راہنما، ذوالفقار علی بھٹو کا سگار سلگاتے ہوئے

بے نظیر بھٹو، پاکستان کی تاریخ کی ایک غیر معمولی سیاسی رہنما

دسمبر 1984ء۔ جرمن صدر Von Weizsacker کو اپنے کاغذات پیش کرتے ہوئے

جرمنی 1966ء ۔ سفیر عبدالرحمٰن خان کے ہمراہ

فروری 1982ء ۔ 2 کشمیر روڈ لاہور پر صدر ضیا الحق، سی ایم لطیف، نگہت اور میرے ہمراہ
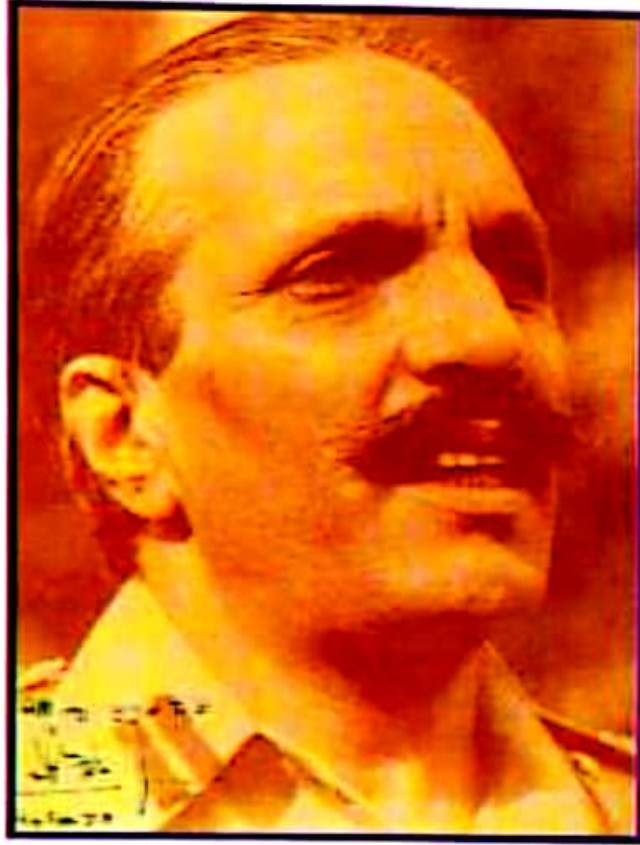
جنرل ضیاالحق، مدبر، ڈپلومیٹ، فوجی، جنہوں نے بھارت کو اس کی حدود میں اور روس کو افغانستان میں مصروف رکھا

فیلڈ مارشل ایوب خان نے جرمنی کے Ludwig Erhard کی طرح
پاکستان کی اقتصادی طاقت کو مہمیز دی

بون، جرمنی 1986ء   جرمن چانسلر ہلمٹ کوہل کے ساتھ

کولون ایئرپورٹ جرمنی پر بینا، نگہت اور ظافر کے ہمراہ

September 4th '66

My dear Wahid,

I would not like to leave before thanking you for the very pleasant evening we spent with you the other night. I appreciated the gesture very much and will always remember it. I wish you all success and good fortune in your career.

With best wishes,

Yours sincerely,

Zulfikar Ali Bhutto

By hand

Abdul Wahid Esquire
P F S
Second Secretary
Pakistan Embassy

ذوالفقار علی بھٹو کا خط۔4 ستمبر 1968ء

روم کے اسلامک سینٹر کا سنگ بنیاد مصنف نے رکھا

پاکستان گولف ٹورنامنٹ، بون جرمنی، تقریب تقسیم انعامات

1982ء ۔ ویٹی کن، روم میں پوپ جان پال دوم کے ہمراہ

فروری 1982ء ۔ پوپ جان پال دوم، نگہت کا خیر مقدم کرتے ہوئے ۔ شفیقہ ضیاالحق درمیان میں موجود ہیں۔

1986ء - ظافر، کولون ایئرپورٹ پر

شیش محل لاہور قلعہ میں ظافر کی ندا (نکول) کے ساتھ منگنی

(بائیں سے) مارگریٹ (ندا کی والدہ)، ندا، ظافر، نگہت، مصنف اور ماہ بینا

پاکستان نیوکلیئر بم کے خالق ڈاکٹر اے کیو خان اور سابق سفیر پاکستان میاں عبدالوحید

کیا مگر ناکام رہا۔

متعدد ای این ٹی سرجن گلے کی مسلسل سوزش سے چھٹکارے کے لیے مجھے ٹانسلز نکلوانے کا مشورہ دے چکے تھے جس پر عمل میں نے ویانا کے ایک مقامی کلینک کے ذریعے کیا۔ شام میں ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے سفارتخانے سے ہدایت جاری ہوئی ہے کہ مجھے اسی شام کلینک سے ڈسچارج کر دیا جائے۔ ڈاکٹر حیران مگر لاچار تھا کیوں کہ اسے انور مراد کی سیکریٹری نے فون کر کے سفیر کا پیغام دیا تھا۔

1972ء کے اوائل میں میری کونسلر کے درجہ پر ترقی ہوگئی۔ یہ خوشخبری مجھے احمد کمال نے بتائی۔ مجھے ترقی کا اطلاع نامہ بھی موصول ہوا۔ ترقی کا باضابطہ اقرار نامہ سفارتی بستے کے ذریعے پہنچا جو انور مراد نے مجھے مطلع کیے بغیر اپنے دراز میں رکھ لیا۔ میں دو ہفتے تک بے خبر رہا۔ اس نے میری خراب ترین رپورٹ بناتے ہوئے ڈی، ای حتیٰ کہ ایف گریڈ تک دیا۔ افتخار علی کی جگہ لینے والے سیکریٹری خارجہ مسٹر علوی نے اس رپورٹ کو رد کر دیا۔ ایک روز میں ان کے دفتر بیٹھا تھا تو میں نے ان کو اس رپورٹ کی اطلاع دی۔

وزارتِ خارجہ کے افسران کی اے سی آر (ANNUAL CONFIDENTIAL REPORT) کے ذمہ دار سپیشل سیکشن ایڈمنسٹریشن کے سیکشن افسر یونس گنگی تھے۔ مسٹر علوی نے اپنے شاف افسر سے کہا کہ اردلی سے کہو کہ میری اے سی آر لائے۔ انہوں نے رپورٹ پر اپنے ریمارکس لکھے، ''وحید بہترین افسر ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ رپورٹ اور اس میں موجود ریمارکس مسترد کیے جاتے ہیں۔'' میرے سفارتی کیریئر کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب مجھے اپنی اے سی آر کے حوالے سے پریشانی ہوئی۔ اس سے قبل اور بعد میں بھی ایسا پھر کبھی نہ ہوا۔

صدر یحییٰ خان نے ''بلیک بیوٹی'' کے لقب سے مشہور مسز کے این حسین کو ویانا کا سفیر مقرر کیا۔ وہ اپنے والد (مشرقی پاکستان ہائیکورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس) کے ہمراہ انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائزیشن کی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئیں۔ انور

پاکستان نیوکلیئر بم کے خالق ڈاکٹر اے کیو خان اور سابق سفیر پاکستان میاں عبدالوحید

مراد ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکے تھے مگر اس کے باوجود اپنے دوست ایس ایم خان کے طفیل نوکری سے چپکے ہوئے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ، پاکستان کے لیے بدقسمت مگر انور مراد کے لیے بہتر ثابت ہوا اور انہیں ترکی میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔ مسز حسین، انور مراد کی جگہ لے چکی تھیں، اس کے باوجود وہ انہیں کانفرنس کے دوران مسلسل زچ کرتا رہا۔ اس طرح ایک اور بنگالی خاتون خودساختہ پنجابی کی تذلیل کا شکار ہوئی۔

ویانا خوبصورت شہر ہے اور اس کے گردونواح مزید دلکش ہیں۔ یہاں تعیناتی کے بعد رہائش گاہ کی تلاش میں ہم شہر سے باہر نکل گئے اور ویانا سے 30 کلومیٹر دور ایک خوبصورت قصبہ کلوسٹرنبرگ (KLOSTERNEUBURG) پہنچے۔ دراصل ہمیں وہاں چیری کا بہت بڑا درخت پسند آ گیا جو پھل سے لدا ہوا تھا۔ چوں کہ ویانا 30 کلومیٹر دور تھا اور مجھے یونائیڈڈ نیشنز انٹرنیشنل ڈولپمنٹ آرگنائزیشن (UNITED NATION INTERNATIONAL DEVELOPMENT ORGANIZATION) اور آئی اے ای اے (INTERNATIONAL ATOMIC ENERGY AGENCY) سے میٹنگز میں حصہ لینا ہوتا تھا، لہٰذا ایک ہی دن میں کئی بار کلوسٹرنبرگ سے ویانا کے چکر لگتے۔ مجھے احساس ہوا کہ میں ٹیکسی ڈرائیور بن چکا ہوں اور دن کا بیشتر حصہ گاڑی چلاتے گزر جاتا ہے۔ میں نے سفارتخانہ اور دونوں بین الاقوامی ایجنسیوں کے قریب قیام گاہ کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر ویانا کے سینٹر میں مجھے ایک فلیٹ کرائے پر مل گیا۔

ویانا میں تعیناتی پرلطف اور سودمند تھی کیوں کہ وہاں بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی اور اقوامِ متحدہ کی تنظیم برائے صنعتی پیداوار کے دفاتر تھے جب کہ ہمارے سفارتخانہ کا دونوں اداروں کے ساتھ کام کرنے کا ذمہ دار تھا۔ دونوں کے ساتھ کام کرنا مشقت طلب مگر پاکستانی نقطۂ نظر سے فائدہ مند تھا۔

اگرچہ آسٹریا عالمی جنگوں میں متعدد علاقے کھو کر کثیرالحجم نہ رہا مگر ویانا کسی دَور میں یورپ میں پھیلی سلطنت ہیبسبرگ کا دارالحکومت رہ چکا تھا۔ نپولین کی جنگوں کے

بعد ویانا کی حکومت نے اسی شہر میں ن معاہدہ کیا تھا۔ آسٹریا میں تا حال بین الاقوامی سفارتکاری کی شان و شوکت باقی تھی۔ آسٹریا کے لوگ بہت ہوشیار اور جرمنوں کے برعکس بہ وقت ضرورت عین وقت پر معاہدے توڑ سکتے ہیں۔

جرمنی میں پہلی تعیناتی کے دوران مجھے احساس ہوا تھا کہ جرمن لوگ قابل بھروسا ہیں۔ میں اکنامک اسسٹنس، جس میں کیپٹل ایڈ اور ایکسپورٹ کریڈٹس شامل تھے، کے ساتھ وابستہ تھا لہٰذا ہمیں قرضوں کی شرائط وضوابط کے لیے جرمن بینکوں سے پاکستان کے لیے خریدے گئے سامان کی قیمتوں کے معاملات طے کرنا پڑے۔ متعدد مواقعوں پر ہم نے مراسلاتی تبادلہ کے بغیر اپنی، اپنی ڈاکومنٹ پر معاہدے درج کیے۔ جرمنی میں میری تینوں تعیناتیوں کے دوران ایسا کبھی نہ ہوا کہ بغیر لکھے معاہدوں اور قیمتوں پر کوئی مسئلہ ہوا ہو۔

عبدالرحمان خان اکثر جرمن لوگوں کی با اعتباری کا ذکر کرتے تھے اور میں ان سے اتفاق کرتا تاہم دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی وعدہ خلافی پر سوالیہ نشان تھا۔ جب میں آسٹریا تعینات ہوا تو یہ معمہ بھی حل ہوگیا کیوں کہ ہٹلر پیدائشی طور پر جرمن نہیں آسٹرین تھا۔

میں نے شاہی خاندان، صحافت اور اہم شعبوں سے وابستہ بے شمار آسٹرین سے دوستی کی۔ ہیلوگ ہیسبرگ (HELVIG HABSBURG)، خاندان ہیسبرگ کا چشم و چراغ اور آسٹریا کے شاہی خاندان کی رشتہ دار تھی جو میری اچھی دوست بن گئی۔ وہ یونیورسٹی آف ویانا میں پڑھاتی اور بین الاقوامی تعلقات کے مضمون پر خوب گرفت رکھتی تھی۔

بنگلہ دیش میں حملہ سے قبل اندرا گاندھی نے ویانا سمیت یورپی ممالک کے متعدد دارالحکومتوں کا دورہ کیا جہاں سیاسی قیادت سے ملاقات کے ساتھ انہوں نے عوامی اجلاس سے بھی خطاب کیا۔ ہیلوگ نے مشرقی پاکستان کے مسئلہ پر پاکستان کا موقف آسٹرین تک پہنچاتے ہوئے ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔

ہم اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ آسٹریا کے صدر اور وزیراعظم نے اندرا گاندھی کو پاکستان سے جنگ نہ کرنے کی تلقین کی۔ ایک عوامی اجتماع میں بھارتی وزیراعظم نے کہا کہ مشرقی پاکستان سے لوگوں کے بھارت میں انخلا سے ہم پر بہت دباؤ تھا اور اس کی روک تھام کے لیے بھارت کو مسئلہ میں کودنا پڑے گا۔ ان کا اندازِ بیان واضح اشارہ تھا کہ وہ بھارت کو پاکستان سے جنگ کے لیے تیار کر رہی ہیں۔

بنزل (BUNZL) خاندان یورپ میں کاغذ کے (MANUFACTURERS) میں سے ایک تھا۔ ان کے ساتھ میری اچھی دوستی تھی اور انہوں نے بھی مشرقی پاکستان کے حوالے سے کافی مدد کی۔

پیرس میں Alliance Francaise سے پڑھائی کے دوران میری ملاقات انسبرگ سے تعلق رکھنے والی اعلیٰ شخصیت کی مالک آسٹرین خاتون انگبرگ ریوٹس INGEBURG-RUITZ سے ہوئی تھی۔ وہ انسبرگ کے مشہور انٹرنیشنل ہوٹل مینجمنٹ انسٹیٹیوٹ سے ڈگری یافتہ تھی۔ ویانا پہنچنے پر میں نے اس سے رابطہ کیا اور اس کے ذریعے پاکستان کی مدد کے لیے لوگوں کو اکٹھا کیا۔

جونہی مسئلہ پیچیدہ ہوا، بھارت نے اپنی فضائی حدود سے ڈھاکہ جانے والی پی آئی اے (PIA) کی پروازوں پر پابندی عائد کردی جنہیں کولمبو کے ذریعے متبادل مگر طویل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ پاکستان نے انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائزیشن سے بھارتی پابندی ختم کرانے کی اپیل کی۔ ہماری درخواست آئی سی اے او میں سماعت کے لیے ویانا پہنچی۔ پاکستان سے وکیل شریف الدین پیرزادہ نے وکالت کرتے ہوئے حکام کو مقدمہ کا جلد فیصلہ کرنے کا کہا کیوں کہ انصاف کی دیر سے فراہمی، ناانصافی کے زمرے میں آتی۔ افسوسناک امر یہ کہ اپیل کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

بین الاقوامی برادری نے جنرل اسمبلی میں مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کی مخالفت کرتے ہوئے اسے اپنے فوجی دستے فوری واپس بلانے کا کہا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں قرارداد پر عملدرآمد کا کوئی طریقہ کار نہیں ہے۔ صرف سکیورٹی کونسل اپنی

قرارداد پر عملدر آمد یقینی بناتی ہے اور ضرورت پڑنے پر اقوام متحدہ کے فوجی دستوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے دوست ممالک کی تمام تر کوششیں سوویت یونین کے ویٹو کی وجہ سے رائیگاں گئیں۔

یحیٰی خان نے بھٹو کو نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ تعینات کیا تھا جن کے زیر قیادت پاکستانی وفد اقوام متحدہ پہنچا۔ بھٹو پر الزام ہے کہ انہوں نے اسمبلی اجلاس میں سوویت یونین اور پولینڈ کی مشترکہ قرارداد کی کاپی پھاڑ دی جس میں بھارت اور بالخصوص پاکستان کو مشرقی پاکستان سے فوج واپس بلانے کی تجویز دی گئی تھی۔ بھٹو کو اس پر موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیوں کہ قرارداد تسلیم کرنے کا مطلب مشرقی و مغربی پاکستان کی علیحدگی ہی تھا۔

بھارت کے مشرقی پاکستان پر حملے کے دوران آسٹریا کے مشہور صحافی اور میرے دوست ویسٹ فال نے ہمیں پیش رفت سے مطلع رکھا۔ اگر چہ ریڈیو پاکستان بنگال میں پاک فوج کی فتوحات کی نوید سنا رہا تھا تاہم حقیقت اس کے برعکس تھی۔

مشرقی پاکستان میں شکست

16 دسمبر 1971ء کو جنرل نیازی نے ڈھاکہ میں بھارتی جنرل اروڑا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جس سے سقوطِ ڈھاکہ واقع ہو گیا۔ بھارت نے جنگی قیدیوں کے متعلق جنیوا کنونشن 1949ء کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 93 ہزار پاکستانی فوجیوں، عورتوں، بچوں اور دیگر شہریوں کو جنگی قیدی بنا لیا۔ یہ قیدی 1974ء تک بھارت میں قید رہے۔

آسٹرین ٹی وی نے جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کی ویڈیو بھی دکھائی۔ جنرل اروڑا کا بہیمانہ رویہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے ایک جرنیل کے دوسرے جرنیل کے ساتھ سلوک کی بجائے ایک گھٹیا اور پست ذہن شخص جیسا برتاؤ کیا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اندرا گاندھی نے خود سری کے انداز میں کہا کہ ہزار سالہ

شکست کا بدلہ لے لیا گیا۔ انہیں بھارت کے اعلیٰ ترین اعزاز اشوکا چرخہ سے نوازا گیا۔

سقوط ڈھاکہ کی خبر سن کر دل رو دیا۔ اس سانحے نے ہمارے سر شرم سے جھکا دیئے۔ شام کو ہم کچھ دوستوں کے ساتھ میٹرو سٹیشن کے قریب ریستوران میں ڈنر کے لیے گئے۔ ہم آرڈر کے بعد ڈنر کا انتظار کر رہے تھے کہ دو دلکش خواتین پاس آئیں جو جاننا چاہتی تھیں کہ ہمارا تعلق کہاں سے ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا تعلق بھارت سے ہے۔ انہیں پاکستان کا بتاتے ہوئے ہم بہت شرمندہ تھے کیوں کہ شکست کے بعد بھارتی سینہ تان کر پھر رہے تھے۔

آسٹریا کے مشہور اخباروں میں سے ایک THE PRESSE نے اپنے ایڈیٹوریل میں لکھا، ''مسٹر بھٹو کی اقتدار کے لیے ہوس نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔'' اگر چہ یہ کسی حد تک درست ہوسکتا ہے کیوں کہ اس میں مشرقی پاکستان کو نظر انداز کرنے اور اقتدار میں برابر حصہ نہ دینے کے حوالے سے آخری مراحل کا ذکر ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی آبادی کل پاکستان کا 50 فیصد سے زائد تھی لہٰذا اقتدار میں ان کا حصہ بھی اسی تناسب سے بنتا تھا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کا آغاز تو دراصل 1948ء سے ہی ہو گیا تھا جب بنگالی زبان کو اردو سے تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی جس کے بعد ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے دیگر حصوں میں لسانی فسادات کا آغاز ہوا۔ یہ بڑی غلطی تھی کیوں کہ بنگالی زیادہ بہتر اور ہزاروں سال پرانی زبان تھی جب کہ اردو مغل حکمرانوں کی اختراع اور اس کی عمر چند صدیوں پر محیط تھی۔

1970ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان سے واضح اکثریت حاصل کرنے پر بھٹو اقتدار میں حصہ کے حق دار تھے۔ شیخ مجیب نے بھٹو کے ساتھ مشترکہ حکومت بنانے سے انکار کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ ان کی چند سیٹوں پر جیتنے والی چھوٹی پارٹیوں کو پیشکش غیر سنجیدہ تھی۔ ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ آگے کرنے کا اختیار صدر مملکت یحیٰی خان کو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمان نے یحیٰی خان کو صدر تسلیم

کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد آخرالذکر نے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا سیشن ملتوی کر دیا جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔

ویانا میں ہمارے سفیر جنرل گل حسن، جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ شام گزارتے اور پر مزاح شخصیت تھے، انور مراد کی جگہ تعینات ہو گئے۔ ہم گل حسن سے سقوط ڈھاکہ بارے استفسار کرتے تو وہ خود کو ذمہ دار ٹھہرانے سے کتراتے ہوئے کہتے کہ ان کا اس سانحہ میں کوئی کردار نہیں تھا کیوں کہ تمام اہم فیصلے انہیں اعتماد میں لیے بغیر کیے جاتے۔

جنرل گل حسن پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ وہ عمدہ لباس اور شام کی محفلوں کے شوقین تھے۔ مے نوشی کرتے مگر ایک حد تک۔ مہمان نواز تھے اور ماتحت عملہ سے اچھا سلوک برتتے۔ دفتری اوقات کے بعد ماتحتوں سے دوستوں کی طرح پیش آتے۔ گل حسن نے جنرل اکبر خان (راولپنڈی سازش میں ملوث) سے ملاقات کا واقعہ سنایا۔ وہ نگران آرمی چیف کی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے کہ جنرل اکبر خان نے ان سے ملاقات کی درخواست کی۔ انہوں نے کوئی اور جنرل اکبر سمجھ کر ملاقات کی ہامی بھر لی۔ جب غلط شخص کو اپنے سامنے پایا تو الجھن محسوس ہوئی لیکن انہیں دفتر سے نکالنا خاصا غیر مناسب تھا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے گل حسن نے ٹانگیں میز پر رکھ لیں۔ اکبر خان نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ ہمیشہ ایسے ہی ٹانگیں رکھ کر بیٹھتے ہیں۔ گل حسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ اس طرح بیٹھنا آرام دہ ہے، اگر چاہیں تو آپ بھی اپنی ٹانگیں میز پر رکھ سکتے ہیں۔

بھٹو نے صدر پاکستان بنتے ہی سابق صدر ایوب خان کے سیکریٹری اطلاعات الطاف گوہر کو جیل بھجوا دیا۔ کسی کو ان کی گرفتاری کی وجہ معلوم نہ تھی۔ ویانا میں گل حسن نے مجھے بتایا کہ بھٹو نے تاشقند معاہدہ کا مسودہ اپنے ہاتھوں سے درست کیا تھا۔ وہ ہمیشہ معاہدۂ تاشقند کی مخالفت کرتے اور اسے ایوب خان کی سنگین غلطی قرار دیتے تھے۔ بھٹو نے الطاف گوہر سے اپنے ہاتھوں سے درست کردہ مسودہ مانگا تو انہوں نے انکار کر دیا جس کی پاداش میں انہیں جیل بھجوا دیا گیا۔ چوں کہ الطاف گوہر جیل کی سختیاں جھیلنے کا

تجربہ نہیں رکھتے تھے لہٰذا جلد ہی ہتھیار ڈال دیے اور مسودہ بھٹو کے حوالے کر دیا۔ انعام کے طور پر الطاف گوہر کو روٹی پلانٹس ملے اور ان کے بھائی ملائیشیا میں پاکستان کے سفیر تعینات ہوئے۔

ویانا کا سفارتخانہ ہی ہنگری میں پاکستان کی نمائندگی کرتا تھا۔ یہ خوش مزاج اور خوبصورت لوگوں کی سرزمین ہے جو دوسری جنگ عظیم میں سوویت یونین کے غیظ و غضب کا نشانہ بنی۔ ہنگری کے عوام نے 1956ء میں سوویت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا مگر ناکامی ہوئی۔ بداپسٹ (BUDAPEST) میں چند دوروں کے دوران میں نے سینئر اہلکاروں خصوصاً ہنگرین دفتر خارجہ کے افسران سے تعلقات استوار کر لیے۔ سقوط ڈھاکہ کے فوری بعد ایک اہم تقریب میں شرکت کے لیے بڈاپسٹ گیا۔ اگرچہ ہنگری نے مجبوراً سوویت یونین کا ساتھ دیا تھا مگر افسران نے مجھے نجی طور پر بتایا کہ ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں۔ چیکوسلواکیہ کا دارالحکومت پراگ، ویانا کے قریب ہی تھا۔ ہمارا سفارتی عملہ سستے کرسٹل اور نیپکن خریدنے پراگ جایا کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد میں ایک دکان پر نیپکن خریدنے گیا۔ سیلز گرل نے میری قومیت پوچھی۔ جب میں نے بتایا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے تو اس نے فوراً کہا، ''روسی سور ہیں۔'' وہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے پر روسی حمایت اور 1968ء میں چیکوسلواکیہ پر روسی حملے سے واقف تھی۔ پراگ انتہائی خوبصورت شہر ہے اور پراگ یونیورسٹی سب سے پرانی جرمنی یونیورسٹی تھی۔

پاکستان میں آسٹریا کے سابق سفیر ڈاکٹر شمِد (SCHMIDT) نے پاکستان اور اپنی حکومت دونوں کو سوات میں مالم جبہ کے مقام پر سکی ریزورٹ (SKI RESORT) کی تجویز دی۔ مارچ 1971ء میں میری ویانا تعیناتی سے پہلے ہی اس معاملہ پر بات چیت چل رہی تھی۔ اس منصوبہ پر قریباً 40 لاکھ ڈالر لاگت آنی تھی جو زیادہ نہ تھی۔ آسٹرین دفتر خارجہ سے ملاقاتوں کے دوران اس موضوع پر کچھ بار بحث ہوئی مگر آسٹرین حکومت کا جواب حوصلہ افزا نہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم نے خود کو شرمندگی سے

ہمکنار کیا ہے۔اگر ہم بھیک بھی مانگتے تو یہ رقم ہمیں مل جاتی۔ کچھ جگہوں پر بات کی جاتی تو ہمیں مطلوبہ رقم آسانی سے مل جاتی۔

پاکستان سے دو افسران جن میں سے ایک کا تعلق سول سروس جب کہ دوسرے کا صوبائی سروس پنجاب سے تھا، اقوام متحدہ کی انڈسٹریل ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن کی ورکشاپ ایڈمنسٹریشن میں شرکت کے لیے ویانا آئے۔ غیر رسمی گفتگو کے دوران صوبائی افسر نے بتایا کہ اس نے اپنی سروس کے دوران اچھا منتظم بننے کے لیے یہ طریقہ سیکھا تھا کہ ہاتھ میں جوتا اور سر پر پگڑی ہونی چاہیے اور دوسرا یہ کہ افسر سے سر پر جوتا کھانے کے لیے تیار اور اپنے ماتحتوں کو جوتے مارنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

پی آئی اے کو ویانا سے اچھی آمدن ہوتی تھی۔ لوگ مختلف یورپی ممالک سے اپنی منزل کے لیے پی آئی اے سے پرواز کرتے۔ مضبوط اعصاب اور دوستانہ رویہ کا مالک قمر خان ڈسٹرکٹ مینیجر تھا۔ اس کی بیوی سید قاسم رضوی کی بیٹی تھی جنھوں نے حیدر آباد دکن میں انڈین فوج کے خلاف جنگ کی تھی۔ قمر کا چھوٹا بھائی پاک بحریہ میں افسر اور اس وقت پاکستانی آبدوز غازی میں موجود تھا جب وہ مالا بر سمندر میں بھارتی حملے کا نشانہ بنی۔ قمر نے ان سانحات کو حوصلہ مندی سے برداشت کیا۔ ویانا میں ایک پاکستانی بزنس مین میرے آفس آیا اور شکایت کی کہ کونسلر افیئر ز کے انچارج تھرڈ سیکریٹری نے اس کے پاسپورٹ پر شامل ممالک کی فہرست میں جرمنی کا نام ڈالنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے مجھے ٹیکسٹائل سے وابستہ جرمن فرم کا دعوت نامہ دکھایا۔ میں نے تھرڈ سیکریٹری کو حکم دیا کہ وہ فہرست میں جرمنی سمیت دیگر ممالک کا بھی اندراج کرے۔ میں نے اس سے معذرت کی اور بتایا کہ پاکستان کے زر مبادلہ کا انحصار پاکستانی کاروباری طبقہ پر ہے۔

ایک روز ویانا کے سب سے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور ہرزمانسکی (HERZMANSKI) کا مینیجر میرے پاس آیا اور زرد رنگ کا چھوٹا تولیہ دکھایا جو اس نے کسی پاکستانی بزنس مین سے خریدا تھا۔ صرف ایک دُھلائی کے بعد اس کا رنگ پھیکا پڑ چکا

تھا۔ میں نے مینیجر سے تولیے کی قیمت پوچھی جو ٹشو پیپر سے بھی کم تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اچھا بزنس مین نہیں۔ اگر اسے بہتر معیار چاہیے تھا تو قیمت بھی بہتر ادا کرتا۔ پاکستان میں بھی مینوفیکچرر کو پیداواری لاگت پوری کرنی ہوتی ہے۔ پاکستانی سپلائر اور ڈپارٹمنٹل والے نے ایک دوسرے کو دھوکہ دیا تھا۔ وہ پریشان ہو کر چلا گیا۔ ریستوران اور دکانیں اکثر اپنے گاہکوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے۔ DREI HUSSAR (تین گھڑسوار) ذائقہ دار کھانوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہ ریستوران ان اشیا کو بھی بل میں شامل کر دیتا جو گاہک نے منگوائی ہی نہ ہوتیں۔ ایک بار میں نے بھی ریستوران کی مینجمنٹ کو رنگے ہاتھوں پکڑا۔

ساتواں باب

سقوط ڈھاکہ 16 دسمبر 1971ء

دفتر خارجہ میں تعیناتی

1969ء تا 1971ء میں نے قریباً ایک سال کے لیے رنگون میں قائم قام سفیر کے فرائض انجام دیئے۔ مجھے براستہ ڈھاکہ مغربی پاکستان جانے کا موقع ملتا رہتا۔ میں مغربی پاکستان کے لیے مشرقی پاکستان کی ناپسندیدگی کا چشم دید گواہ ہوں۔ ڈھاکہ میں قریباً تمام سائن بورڈ اور سڑکوں کی معلومات بنگالی زبان میں تھیں۔ مشرقی و مغربی پاکستان میں خلیج تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ڈھاکہ میں مقیم مغربی پاکستانی بھی گھروں سے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔ ویانا تبادلہ سے قبل مارچ 1971ء میں مَیں آخری بار ڈھاکہ گیا۔ اس وقت تک دونوں قطعات میں ناقابل درستی دراڑ پڑ چکی تھی۔ 1970ء کے سیلاب سے مشرقی پاکستان شدید متاثر ہوا جس نے محرومی میں مزید اضافہ کیا۔

دسمبر 1970ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب کی عوامی لیگ قریباً تمام سیٹیں جیتی۔ مغربی پاکستان سے بھٹو کی پیپلز پارٹی نے میدان مار لیا۔ شیخ مجیب کا مغربی پاکستان سے بڑی پارٹی کی بجائے چھوٹی سیاسی جماعتوں کو نمائندگی کی خواہش حقیقت پسندانہ نہیں تھی۔ ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس مارچ 1971ء میں ہونا تھا۔ جیسے

ہی بھٹو اور مجیب میں مذاکرات ناکام ہوئے پیپلز پارٹی کے قائد نے قومی اسمبلی اجلاس کے التوا کا تقاضا کر دیا۔ انہوں نے دھمکی بھی دی کہ اگر اجلاس ہوا تو وہ کراچی سے خیبر تک آگ لگا دیں گے۔ بھٹو نے شیخ مجیب کو یہ بھی کہا کہ اُدھر تم اِدھر ہم۔ بھٹو نے یہ بھی کہا کہ مغربی پاکستان سے منتخب اراکین اسمبلی صرف ون وے ٹکٹ پر ہی جائیں گے۔ جو جائیں گے ان کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ جنرل یحییٰ خان نے اسمبلی اجلاس ملتوی کر دیا جس پر بھٹو نے کہا، ''اللہ کا شکر ہے پاکستان بچ گیا۔''

اجلاس ملتوی ہوتے ہی مشرقی پاکستان میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ویانا میں میری خدمات کے آخری مرحلہ کے دوران ہمارے سفیر گل حسن خان تھے جو پاک فوج کے چیف آف جنرل سٹاف بھی رہے۔ میں نے ان سے مشرقی پاکستان کے مسئلہ، بھارت سے جنگ اور سقوطِ ڈھاکہ کے بارے میں کئی سوالات کیے۔ انہوں نے خود کو بے قصور ٹھہراتے ہوئے کہا کہ جنرل پیرزادہ اور جنرل حمید اصل مشیر اور یحییٰ خان کے بہت قریب تھے جنہوں نے ان معاملات میں اہم کردار ادا کیا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ فوج نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر اجلاس ہوا تو فسادات ہوں گے کیوں کہ بھٹو نے کہا تھا کہ وہ کراچی سے خیبر تک آگ لگا دے گا جس سے فوج کو خدشہ ہوا کہ مغربی پاکستان میں حالات اتنے بگڑ جائیں گے کہ ان پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔ انہوں نے یحییٰ کو بھی ذمہ دار قرار دیا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مجیب ان کی ملکی صدارت جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔

1971ء میں ہنری کسنجر پاکستان سے چین گئے جہاں ان کی ملاقات چواین لائی (CHOU EN LAI) سے ہوئی۔ یہ امریکہ اور چین کے مابین پہلا باضابطہ رابطہ تھا۔ چواین لائی نے امریکہ کو کہا کہ دونوں ممالک کے درمیان رابطے کے لیے پُل کا کردار ادا کرنے والے ملک (پاکستان) کا خیال رکھا جائے۔ مشرقی پاکستان میں گمبھیر صورتِ حال اور بعد ازاں بھارتی حملہ کے دوران امریکہ اس پُل کو بھول گیا۔

1971ء سے کافی عرصہ قبل ہی امریکہ نے مشرقی و مغربی پاکستان میں علیحدگی کا

منصوبہ بنایا تھا۔اس نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے ترقیاتی فنڈ بھی قائم کیا۔اس وقت امریکی فوج کے چیف آف دی جوائنٹ چیفس آف سٹاف جنرل میکس ویل بی ٹیلر نے امریکی سینیٹ میں یہ بیان بھی دیا کہ امریکہ اور سوویت ایک ہی مقصد پر عمل پیرا تھے۔ یہ مقصد پاکستان کو دولخت کرنا تھا۔مقصد میں کامیابی کے لیے امریکہ سیاسی جب کہ سوویت یونین نے فوجی جارحیت سے اس مقصد کو حاصل کیا۔ دسمبر 1971ء میں بھارت کی مشرقی پاکستان میں مداخلت کے دوران امریکی صدر نکسن نے ساتویں بحری بیڑے کو بحرِ ہند پیش قدمی کا حکم دیا۔ پاکستان کو غلط فہمی ہوئی کہ بیڑہ ان کی مدد کو آرہا ہے تاہم وہ نظر نہ آیا۔ بحری بیڑے کی پیش قدمی کا مقصد بھارت کو مغربی پاکستان میں فوجی مہم سے باز رکھنا تھا۔

آٹھواں باب

دفتر خارجہ واپسی (76-1972ء)

پاکستان دولخت ہوتے ہی سینٹرل سپیریئر سروسز میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ خارجہ خدمات کا شعبہ چھوٹا تھا لہٰذا اسے شدید مشکلات کا سامنا ہوا کیوں کہ بیرون ممالک قریباً تمام بنگالی افسران نے بنگلہ دیش کے لیے خدمات انجام دینے کو ترجیح دی۔ اسلام آباد میں تعینات متعدد افسران کو بھی عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ اچانک ہی بیرون ممالک خدمات کے لیے دستیاب افسران کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔ مجھے وقت سے پہلے ہی ویانا سے بلا لیا گیا اور سقوط ڈھاکہ سے پیدا ہونیوالے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

میں نے کچھ عرصے کے لیے ڈائریکٹر جنرل جنوبی ایشیا ڈاکٹر مقبول اے بھٹی کے زیر سایہ کام کیا۔ وہ بہت مخلص شخص تھے۔ ہماری متعدد مشترکہ خوشگوار یادیں ہیں۔ عزیز احمد وزیر مملکت برائے دفاع و خارجہ امور بنے تو انہوں نے ستار کو ڈائریکٹر جنرل جنوبی ایشیا تعینات کیا۔ میری اور ستار کی پہلے روز سے نہیں بنتی تھی۔ میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باعث پیدا شدہ انتہائی مشکل اور حساس مسائل کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے تمام توانائیاں اور وقت ان مسائل کے حل میں صرف کیا اور کوئی کمی نہ آنے دی۔ اس کے

باوجود ستار کا میرے ساتھ رویہ شروع سے غیر مخلصانہ تھا۔ میری سوچ کے مطابق اس رویہ کی وجہ یہ تھی کہ ستار کی اپنی اہلیہ اور ایمبیسیڈر انور مراد کی اہلیہ میں انور مراد سے گہرا تعلق تھا جو اس قسم کے رویہ کے ذمہ دار تھے۔ میری ریٹائرمنٹ تک ان کا رویہ منفی رہا۔

بھٹو نے صدر مملکت بنتے ہی کانچ جوڑ کر گھروندا بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے مسلم ممالک کی مدد حاصل کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ اور اسلامی ممالک کے تندوتیز دورے کیے۔ اندرا گاندھی پاکستانی قیادت کے ساتھ گفت وشنید سے انکار کر چکی تھیں لہٰذا بھٹو ماسکو گئے اور برزنیف (BREZHENOV) سے درخواست کی کہ وہ پاک بھارت مصالحت میں کردار ادا کریں۔ اس وقت سیکریٹری خارجہ افتخار علی نے بون میں مجھے بتایا کہ بھٹو نے حقیقی معنوں میں برزنیف کی منت ساجت کی کہ وہ بنگلہ دیش بننے کے بعد پیدا ہونیوالے مسائل حل کرانے کے لیے اندرا گاندھی سے ان کی ملاقات کروائیں۔ شملہ میں پاک بھارت قائدین کی ملاقات برزنیف کی مداخلت کے باعث ممکن ہوئی۔ شملہ میں بھٹو نے وہ سب کیا جو ایک شکست خوردہ قوم کے مفاد میں بہتر تھا۔

سب سے اہم مسئلہ بھارت میں پاکستانی قیدیوں کی وطن واپسی تھا۔ جولائی 1972ء کی ایک چلچلاتی دوپہر کو میں نے دفتر خارجہ میں اپنے کمرے میں ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی کی وہ رپورٹیں پڑھیں جو بھارتی جیلوں میں قید پاکستانیوں کے کیمپوں کے دورہ پر مبنی تھیں۔ ان میں پاکستانیوں پر شدید تشدد کے دل سوز واقعات بیان کیے گئے تھے۔ کچھ کیمپوں میں تو پاک فوج کے افسران کو بلاوجہ گولی ماردی گئی۔ دیگر آرمی کیمپوں میں پاکستان افسران پر کتے چھوڑے گئے اور بعض کو الٹا بھی لٹکایا گیا۔ بعض جگہ تو ان کے جسم پر سگریٹ بھی داغے گئے۔ یاد رہے کہ پاکستانیوں کو دسمبر 1971ء میں جنگی قیدی بنا کر ہندوستان لے جایا گیا تھا، اس وقت سے لے کر جولائی 1972ء میں دفتر خارجہ میں کسی نے بھی ICRC کے جنگی قیدیوں کے معائنہ کے بعد پاکستان کو دی گئی رپورٹوں کو نہیں پڑھا تھا اور پاکستان میں کسی کو جنگی قیدیوں کی حالتِ زار اور ہندوستانیوں کے مظالم کا علم نہیں تھا۔ میں نے اقوام متحدہ میں ہمارے مشن کو نیویارک میں اور تمام ملکوں میں

پاکستانی سفارتکاروں کوخفیہ ٹیلی گرام کے ذریعے ان واقعات سے آگاہ کیا کہ بھارت قیدیوں کے حوالے سے جنیوا کنونشن 1949ء کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

اگلے روز ڈائریکٹر جنرل عبدالستار نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور شملہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے پر میری سرزنش کی کیوں کہ معاہدہ میں دونوں ممالک نے اتفاق کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف منفی پراپیگنڈا نہیں کریں گے۔ مسٹر ستار کی توقع کے برعکس میرے ٹیلی گرام کی پہلی کاپی جو صدر بھٹو کو گئی تھی ان کے تاثرات کے ساتھ واپس آئی۔ انہوں نے لکھا، ''یہ انتہائی سنجیدہ معاملہ ہے۔ اگر ہمارے عوام کو اس بات کا علم ہوا تو ہر جگہ آہ و بکا ہوگی۔ اس مسئلہ کو فوراً بین الاقوامی کمیونٹی تک پہنچائیں۔'' مسٹر ستار کے لیے بھٹو کے تاثرات باعث خجالت تھے کیوں کہ بھٹو نے میرے اقدام کو درست قرار دیا۔

پاکستانی قیدیوں کی وطن واپسی کے مسئلہ کے فوری حل کا حکم ملتے ہی وزارتِ دفاع میں قیدیوں کی امداد اور واپسی کے لیے کمیٹی بنائی گئی۔ میجر جنرل (مرحوم) قمر علی مرزا کو کمیٹی کا چیئر مین مقرر کیا گیا۔ ممبران کا تعلق متعدد وزارتوں اور قیدیوں کی رہائی میں کردار ادا کرنے والی نجی تنظیموں سے تھا۔ کمیٹی کا ہفتہ وار اجلاس وزارتِ دفاع میں ہوتا اور اس کا کردار بہت موثر رہا۔ میں وہاں دفتر خارجہ کی نمائندگی کرتا تھا۔

بین الاقوامی کمیونٹی کے دباؤ اور ریڈ کراس کی رپورٹ کے پیش نظر بھارتی حکام نے پاکستانی قیدیوں سے بہتر برتاؤ شروع کر دیا۔ سویلین قیدیوں سے بھی، جن کی اکثریت سینئر سول ملازمین پر مشتمل تھی، برا رویہ برتا اور ان پر دباؤ ڈالا جاتا۔ کچھ دباؤ برداشت نہ کرتے ہوئے لڑکھڑا گئے متعدد نے بھارتی دباؤ کا دلیری سے سامنا کیا۔

اعلیٰ فوجی افسران بشمول جنرل نیازی کو علیحدہ کیمپ میں رکھا گیا اور ان سے بہتر سلوک ہوتا تھا۔ آئی سی آر سی کی رپورٹس کے مطابق ان کی روزمرہ ضروریات کا خیال اور اخبارات تک رسائی بھی دی جاتی۔

چند پاکستانی سول ملازمین اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد نیپال اور رنگون فرار ہو گئے تھے۔ ان کی واپسی کے اقدامات بھی کیے گئے۔ کھٹمنڈو اور

رنگون میں پاکستان مشن وہاں سے واپسی کے خواہش مند پاکستانیوں کے نام بھیجتے تھے۔ ہم ان کی جانچ پڑتال کے بعد کھٹمنڈو اور برما میں سفارتخانوں کو انہیں بذریعہ پرواز وطن بھیجنے کی ہدایات کرتے۔

ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ میجر نادر پرویز چند فوجی افسران کے ساتھ کھٹمنڈو پہنچے تھے۔ وہ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں خفیہ سرنگ کھود کر فرار ہوئے تھے۔ میں نادر پرویز اور ان کے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا، لہٰذا میں نے مشن کو ہدایت کی کہ انہیں پہلی دستیاب پرواز سے پاکستان بھیجا جائے۔ پاکستان میں صف اوّل کے صنعت کار احمد داؤد کی مشرقی پاکستان میں کرنافلی پیپر ملز تھیں۔ ان کے چند افسران اور رشتہ دار بھی رنگون پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ ان افراد کے بارے میں بہت پریشان تھے اور مجھ سے درخواست کی کہ انہیں فوری پاکستان بلایا جائے۔ رنگون میں مشن کو ہدایت کی گئی کہ ان افراد کو ترجیحی بنیادوں پر پاکستان بھیجا جائے۔

مسلسل بین الاقوامی دباؤ کے باعث بھارت مذاکرات کی میز پر آنے کو تیار ہوگیا جہاں پاکستانی قیدیوں کی وطن واپسی کا معاملہ زیر بحث آیا۔ مذاکرات کا پہلا مرحلہ راولپنڈی میں وزیراعظم کے دفتر میں طے پایا۔ بھارتی وفد کی قیادت پی این حاکسار P.N.HAKSAR کر رہے تھے جو کشمیری ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کے حوالے سے اہم کردار ادا کر چکے تھے۔ مذاکرات ایک ہفتہ جاری رہے مگر ٹھوس نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ تاہم مذاکرات کے دوران اور بعدازاں یہ واضح ہوگیا کہ قیدیوں کو مزید سنبھالنا بھارت کے بس میں نہیں رہا۔ نہ صرف بین الاقوامی برادری اور میڈیا مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے بلکہ بھارتی فوج نے بھی اپنی حکومت کو پاکستانی قیدیوں کی وطن واپسی کی تجویز دی۔ پہلے تو بھارت کو پریشانی لاحق تھی کہ اگر مستقبل میں دونوں ممالک میں جنگ چھڑی تو پاکستان کو بھارتی فوجیوں کو قیدی بنانے کا اخلاقی حق ہوگا۔ دوسرا یہ کہ پاکستانی قیدی بھارتی فوجیوں کے لیے قائم بیرکوں میں قید تھے جس کے نتیجے میں بھارتی فوجیوں کو کھلے آسمان تلے سونا پڑتا۔ پاکستانی قیدیوں کو

مزید وقت کے لیے پابند سلاسل رکھنا بھی مہنگا پڑ رہا تھا۔

مذاکرات کا دوسرا دَور اگست 1973ء کو دہلی میں شروع ہوا۔ پاکستانی وفد کی قیادت وزیر مملکت برائے دفاع اور خارجہ امور عزیز احمد کر رہے تھے جب کہ بھارتی وفد کے سربراہ بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ تھے۔ پاکستانی وفد میں آغا شاہی، عبدالستار، خالد سلیم اور میں شامل تھا۔ بھارتی وفد کی نمائندگی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ، وزیر خارجہ سیکریٹری خارجہ کیول سنگھ، پی این حاکسار، پی این ڈھر اور دیگر افسران کر رہے تھے۔

پہلے چار روز تو بھارتی وفد پاکستانی قیادت کو تنقید کا نشانہ بناتا رہا۔ انہوں نے ہم پر دھوکے باز، بے ایمان، جھوٹے اور ناقابل بھروسا ہونے کے الزامات لگائے۔ دراصل پہلے چار روز کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

پانچویں روز عزیز احمد نے بھارتی وفد کو کہا کہ آپ قیدیوں کی وطن واپسی کے مسئلہ پر بات چیت کے لیے تیار نہیں ہیں، لہٰذا ہمارے وفد نے پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے جس کے لیے اسلام آباد کو ہوائی جہاز بھیجنے کی درخواست کی جا چکی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کو علم ہے کہ اگر بھارت پر حملہ بھی کر دیا جائے تو ہمیں اپنے قیدی واپس نہیں ملیں گے۔ بھارت بڑا ملک ہے اور اگر پاکستان حملہ بھی کرتا تو قیدیوں کو بھارت کے جنوب میں منتقل کر دیا جاتا جہاں پاکستان کی رسائی ممکن نہ ہوتی۔ تاہم انہوں نے متنبہ کر دیا کہ پاکستان واپسی پر ہم جنگ کی تیاری کریں گے۔ ہمیں علم تھا کہ جنگ کی صورت میں ایک ارب ڈالر خرچ کر کے پاکستان جانتا ہے کہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ مگر بھارت بھی چار ارب ڈالر خرچ کرتے ہوئے اقتصادی طور پر تباہ ہو جاتا۔ دراصل عزیز احمد نے بھٹو کے کہنے پر جنگ کی دھمکی دی۔

بھارتی وفد کو جھٹکا لگا اور وہ قیدیوں کی رہائی کے معاملہ میں سنجیدہ ہو گئے۔ چوں کہ مسلمانوں نے کئی سو سال ہندوؤں پر حکومت کی تھی تو حاکم اور محکوم کا فرق مجھے بھارتی وفد سے ملاقات کے دوران بھی محسوس ہوا۔ مذاکرات میں بنیادی رکاوٹ مشرقی

پاکستان میں مقیم بہاریوں کے واپسی کا معاملہ تھا۔ بھارت چاہتا تھا کہ پاکستان 40 ہزار بہاری واپس لے جب کہ ہمیں ہدایات تھیں کہ 25 ہزار پر سمجھوتہ کیا جائے۔ بھارت اس پر ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا، لہٰذا ہم نے واپسی کے لیے اسلام آباد سے طیارہ بھیجنے کا کہہ دیا۔ جیسے ہی بھارتی وفد کو علم ہوا کہ ہم معاہدہ پر دستخط کیے بغیر ہی واپس جا رہے ہیں، وہ فوراً 25 ہزار بہاریوں کے لیے مان گئے۔ معاہدہ پر دستخط ہماری وطن واپسی سے چند منٹ پہلے ہی ہوئے تھے۔

بھارتی حکام نے ہمیں آگرہ اور تاج محل بھی دکھایا۔ یہ مغل شاہکار حقیقتاً دلکش اور دنیا کے سات عجوبوں میں بجا طور پر شمار ہوتا ہے۔ آگرہ دورہ کے دوران کسی نے ہمیں ایک کاغذ تھمایا جس پر لکھا تھا کہ چند پاکستانی فوجی افسران آگرہ کے خفیہ کیمپوں میں مقید ہیں۔ بھارتی حکام نے آئی سی آر سی کو اس امر سے لاعلم رکھا تھا۔ ہم نے آئی سی آر سی سے رابطہ اور اس بات کی حقیقت جانی۔ جنرل ٹکا خان نے بھارتی آرمی چیف جنرل مانک شاہ کے دورۂ لاہور کے دوران ان سے اس معاملہ پر بات کی۔ اس کے بعد وہ افسران دیگر ساتھیوں کے ساتھ دوسرے کیمپس میں منتقل کر دیے گئے۔

مذاکرات کے دوران ایک واقعہ بھی پیش آیا جس نے بھارت کے پاکستان پر ناقابل بھروسا ہونے کے الزام کو ثابت کر دیا۔ ڈی جی عبدالستار نے اندرا گاندھی کے پرنسپل سیکریٹری پی این دھڑ کو کاغذ دیا جس میں ہمارا موقف درج تھا۔ اگلے روز پی این دھڑ اس کاغذ پر اندرا گاندھی سے منظوری کے دستخط کروا کر واپس لائے اور مسٹر عبدالستار کو تھما دیا۔ ہمیں کوفت ہوئی جب عبدالستار نے دھڑ کو بتایا کہ انہیں غلط کاغذ دیا گیا تھا۔ پی این دھڑ نالاں ہو گئے اور انہوں نے عبدالستار سے کہا کہ انہوں نے ایک شریف آدمی کو بندر بنا دیا۔ (YOU HAVE MADE A MONKEY OF A PERFECT GENTLEMAN) انہوں نے بڑی مشکل سے اندرا گاندھی کی حمایت حاصل کی تھی اور اندرا گاندھی کے پاس واپس جانا بہت مشکل ہوگا۔ عبدالستار نے واقع ہی مناسب رویہ نہیں برتا تھا۔ غلط کاغذ کا کہنے کی بجائے وہ یہ بھی کہہ

سکتے تھے کہ ہمیں نئی ہدایات موصول ہوئی ہیں۔

بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ نے بہاریوں کے معاملہ پر اندرا گاندھی کے تاثرات سے ہمیں مطلع کیا۔ اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ بھٹو بہاریوں کو لینے سے اس لیے خائف ہیں کیوں کہ وہ کراچی کی آبادی کا تناسب بدل دیں گے اور وہاں سندھی اقلیت اور اردو بولنے والے اکثریت میں ہو جائیں گے۔ اندرا گاندھی نے دہلی کی مثال دی جو اردو بولنے والوں کے شہر سے پنجابی بولنے والوں کے شہر میں بدل گیا۔ اندرا کا تعلق بھی اردو/ہندی خاندان سے تھا۔

بھارتی حکام مغربی محاذ سے قید کیے گئے پاکستانی سپاہیوں کی واپسی پر راضی تھے لیکن وہ بنگلہ دیش سے قید کیے گئے جنگی قیدی کو رہا کرنے سے پہلے بنگلہ دیش کی اجازت چاہتے تھے۔ بنگلہ دیش نے اجازت دیتے یہ شرط رکھی کہ پہلے پاکستان اس کو تسلیم کرے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مغربی پاکستان میں ملازم تمام بنگالی افسران کو معطل اور ان کی سرگرمیوں پر تھوڑی بہت نظر رکھی گئی۔ تاہم انہیں سفر کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، مشرقی پاکستانیوں میں بے چینی بڑھتی رہی۔ وہ بوجھ بننے لگے کیوں کہ وہ انہی رہائش گاہوں میں مقیم تھے جو ان کے متبادل افسران کو ملنی تھیں۔

اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے متعدد تجاویز دی گئیں۔ ان سول سروس آفیسرز جن کے ساتھی ہندوستان میں جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں محصور تھے، انہوں نے تجویز دی کہ مشرقی پاکستان کے افسران کو منگلا کیمپ منتقل کر دیا جائے جہاں وہ مخصوص علاقہ تک محدود ہو جائیں اور اپنے بنگلہ دیش فرار نہ ہو سکیں۔ دفتر خارجہ نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ بنگلہ دیش کے ساتھ مستقبل میں بہتر تعلقات کے لیے ان افراد کو اسلام آباد ہی رہنے دیا جائے۔ اگر کوئی خود سے پاکستان چھوڑنا چاہے تو اسے بھی نہ روکا جائے۔ بھٹو نے دفتر خارجہ کی تجویز سے اتفاق کیا کہ اگر کوئی پاکستان چھوڑنا چاہے تو اسے مصلحتاً نظر انداز کر دیا جائے۔

یہ فیصلہ سودمند ثابت ہوا کیوں کہ جتنے بھی بنگالی افسران پاکستان چھوڑ کر گئے ان کا پاکستان سے رویہ دوستانہ رہا۔ ان میں سے ایک مثال دفتر خارجہ کا سینئر بنگالی افسر نذرالاسلام تھا جس کے ساتھ ہمارا برتاؤ بہت اچھا رہا۔ وہ ہمارے دفتر آیا کرتا اور ہم ساتھ چائے پیتے اور کھانا کھاتے جب کہ شام کو اکٹھے بیڈمنٹن بھی کھیلتے۔

نذرالاسلام نے مجھے بتایا کہ 1966ء میں برن (BERN) (سوئٹزرلینڈ) کے سفارتخانہ میں تعیناتی کے دوران اس نے تب بھٹو کی کچھ مدد کی تھی جب وہ ایوب خان کی کابینہ میں نہیں تھے۔ وہ بھٹو سے ملاقات کے دوران پاکستان چھوڑنے کی اجازت لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ تمہیں اجازت کی ضرورت نہیں، لہٰذا جب بھی جانا چاہو جا سکتے ہو۔ اس سے پیشتر کہ نذرالاسلام کوئی فیصلہ کرتا، اس کے سسر جو دفتر خارجہ میں جونیئر افسر تھے، انتقال کر گئے۔ ہم نے وزیراعظم سے درخواست کی کہ ان کی میت اور خاندان کو بنگلہ دیش جانے کی اجازت دی جائے جو مل گئی۔

آزادی کے وقت پاکستان ان برطانوی افسران کو پنشن دینے پر راضی ہوا تھا جو پاکستان میں خدمات کی انجام دہی کے بعد ریٹائر ہوئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ان برطانوی افسران کی پنشن روک دی گئی۔ مغربی یورپ کے ڈائریکٹر امین جان نعیم نے مجھے فون کیا اور کہا کہ اسلام آباد میں برطانوی سفارتخانہ کے کونسلر مسٹر بولارڈ ان سے بدتمیزی کرتے ہوئے برطانوی افسران کی پنشن کا تقاضا کر رہے ہیں۔ وہ مجھ سے مدد چاہتے تھے۔ وہ مسٹر بولارڈ کو میرے دفتر لے آئے جنہیں میں نے بہت خراب مزاج میں پایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ریٹائرڈ برطانوی افسران کو پنشن دینا پاکستان کا قانونی فرض ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ انگلینڈ نے خود متعدد قانونی تقاضوں کو پامال کیا ہے۔ جب پاکستان ایک تھا تو برطانیہ نے نہ صرف اپنی سرزمین پر بنگلہ دیش تحریک کی اجازت دی بلکہ سیاسی و معاشی تعاون بھی کیا۔ جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو برطانیہ نے نہ صرف بھارتی جارحیت پر خاموشی اختیار کی بلکہ بنگلہ دیش کی تحریک کو بھی بڑھاوا دیا۔ بھارتی فوجی مداخلت کے ذریعے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جب پاکستان

قانونی طور پر متحد تھا، برطانیہ نے یورپی کمیونٹی کو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی ترغیب دی۔ پاکستان صرف اس وقت پنشن دینے کا مجاز تھا جب تک مشرقی پاکستان کے وسائل تک ہماری رسائی تھی۔ اب ایسا نہیں ہے لہٰذا پنشن بھی نہیں مل سکتی۔ بولارڈ غصے میں آ گیا۔آخرکار برطانوی حکومت نے پاکستان سے ریٹائر برطانوی افسران کو خود پنشن دینے کا فیصلہ کیا۔

بولارڈ بعدازاں جرمنی میں برطانیہ کا سفیر مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد میں بھی وہاں بحیثیت سفیر تعینات ہو گیا۔ ہمارے بہت اچھے تعلقات قائم ہو گئے اور جب کبھی بھی اسلام آباد میں ہماری ملاقات کا ذکر ہوتا تو ہم خوب ہنستے۔

بنگلہ دیشی وزیراعظم شیخ مجیب الرحمان نے جون 1974ء میں بھٹو کو بنگلہ دیش آنے کی دعوت دی۔ میں اس ٹیم کا حصہ تھا جو بھٹو کے دورۂ بنگلہ دیش سے قبل ڈھاکہ میں دورے کی تیاریوں کے لیے پہنچی۔ انٹیلی جینس بیورو کے ڈائریکٹر جنرل اکرم شیخ اور ان کا ایک افسر ہمارے ساتھ تھے۔ سینئر سول سرونٹ مظفر احمد جو میرے ہم جماعت رہے اور بھارتی قید سے رہائی پر مجھ سے اسلام آباد کلب میں ملے نے مجھے بلٹ پروف جیکٹ ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا۔ وہ سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے پھوٹنے والے فسادات اور مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستانیوں کے ساتھ دہشت گردی دیکھ چکے تھے۔ میں نے مظفر احمد کو بتایا کہ دفتر خارجہ کے افسران مختلف شخصیت ہوتے ہیں جو بلٹ پروف جیکٹ کی جگہ مسکراہٹ کا استعمال کرتے ہیں۔

ہم نے بنگالیوں کی ڈھاکہ واپسی کے لیے استعمال ہونیوالے سوویت طیارے الیوشن میں سفر کیا۔ یہ پرانا طیارہ تھا جس کی سیٹیں بھی آرام دہ نہ تھیں۔ ڈھاکہ پہنچنے پر ایڈیشنل آئی جی پولیس عمادالدین احمد چودھری کی سربراہی میں وفد نے ہمارا استقبال کیا۔ انہیں میں ساردا میں پولیس ٹریننگ کالج کے دنوں سے جانتا تھا۔ وہ ہمارے وائس پرنسپل اور بہت شریف النفس تھے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''وحید! یہ وہ نہیں جو وہ چاہتے تھے۔ بنگالیوں نے حقوق نہ ملنے پر

احتجاج کیا تھا۔ وہ ایسی کنفیڈریشن چاہتے تھے جو ان کے حقوق کا تحفظ کر سکے۔'' ہم نے سرکٹ ہاؤس ڈھاکہ میں قیام کیا جہاں میں 1960ء میں سول اور خارجہ سروس کے امتحانات کے دوران دو ہفتے گزار چکا تھا۔ وہاں زیادہ تر پرانے خدمت گزار ہی تھے جن کا رویہ بہت دوستانہ رہا۔

بنگلہ دیشی حکومت نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں بہت زور و شور سے پاکستان مخالف مہم چلائی۔ انہوں نے بنگالیوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ پاک فوج نے مشرقی پاکستان میں لوٹ مار، قتل و غارت اور بنگالی خواتین کی عصمت دری جیسے جرائم کیے۔ اتفاق سے ہم نے جنرل ٹکا خان کے سامنے پاکستانی سپاہیوں کے ہاتھوں 72 ہزار بنگالی خواتین سے جنسی زیادتی کا سوال اٹھایا۔ ٹکا خان نے جنسی زیادتی کی تصدیق کی مگر یہ بھی کہا کہ کل تعداد بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں ہم نے ٹکا خان سے کہا کہ سوال تعداد نہیں اصول کا ہے۔ کسی ایک خاتون سے بھی زیادتی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ویسے بھی باغیوں اور ریاست میں فرق تھا۔ باغیوں کی نسبت ریاست کو ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔

میں نے بنگلہ دیشی دفتر خارجہ سے میڈیا میں پاکستان مخالف مہم پر بھی سوال کیا۔ ڈی جی انچارج تعلقات برائے پاکستان اے کے مرشد کا اس حوالے سے جواب منفی تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ شیخ مجیب نے وزیراعظم بھٹو کو دورے کی دعوت دی، للہذا میزبان حکومت کو دوستانہ ماحول قائم کرتے ہوئے پاکستان مخالف مہم بند کرنی چاہیے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ بھٹو، بنگلہ دیش نہ آئیں تو دعوت نامہ واپس لے لیں۔ پاکستان مخالف مہم روکنے کی تمام تر کوششیں رائیگاں گئیں۔ تب میں نذرالاسلام سے ملا جو اس وقت بنگلہ دیش پروٹوکول کا چیف تھا۔ اس کا رویہ بہت مثبت تھا اور وہ مہم رکوانے میں کامیاب رہے۔ بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ کمال الدین اس وقت موجود نہیں تھے، للہذا ان سے ملاقات نہ ہو پائی۔

بنگالیوں کے پاکستان کے ساتھ تعلقات میں مثبت تبدیلی آ چکی تھی۔ جن

بازاروں اور ہوٹلوں میں مغربی پاکستانیوں کو دیکھتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا، وہاں ہمیں دوستانہ رویہ اور جذباتی تاثرات دیکھنے اور سننے کو ملے۔ میں جہاں بھی گیا بنگالیوں نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ جیسے ہی کسی بنگالی کو پتا چلتا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آتا اور دوستانہ انداز میں ملتا۔ مجھے بنگالیوں کے دل میں پاکستان کے لیے مثبت جذبات کا احساس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بھٹو کی بنگلہ دیش آمد پر گرم جوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ بنگلہ دیش میں غربت بڑھ رہی ہے۔ ایسے بہت سے واقعات بھی پیش آئے جہاں مرد وخواتین اس لیے اپنے گھروں سے نہیں نکل پاتے تھے کہ ان کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑے نہ ہوتے۔ میں نے دفتر خارجہ کو بتایا کہ بنگالی، بھٹو کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کریں گے اور دوسرا کہ بنگلہ دیش کو کپڑوں کا عطیہ دے کر ہمیں بہتر تاثر قائم کرنا چاہیے۔ دفتر خارجہ نے وزیر اعظم کو سمری بھجوائی جس میں بنگالیوں کو کپڑوں کے عطیہ کی تجویز شامل تھی، تاہم بھٹو نے اسے منظور نہ کیا۔

وزیر اعظم بھٹو کی ڈھاکہ آمد کے روز بنگالیوں کی کثیر تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ ایئر پورٹ سے ایوانِ صدر تک سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ ''بنگالی، پنجابی بھائی بھائی'' کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ایک نعرہ یہ بھی تھا، ''برائے مہربانی ہمیں اندرا گاندھی کے شکنجوں سے مکتی دلائیں۔'' پاکستان مخالف ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا۔

شیخ مجیب اور بھٹو کے مابین مذاکرات کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ شیخ مجیب نے بنگلہ دیش کے ان اثاثوں کا تقاضا کیا جو پاکستان کے پاس تھے۔ انہوں نے طیاروں، ذرائع نقل وحمل اور دیگر اثاثوں کی تقسیم کا تقاضا کیا۔ اس پر بھٹو کی خاموشی نفی کا اشارہ تھی۔ دونوں قائدین کی گفتگو سے واضح تھا کہ وہ 16 دسمبر 1971ء سے پہلے کے حالات میں نہیں لوٹنا چاہتے۔

بنگلہ دیشی حکومت نے پاکستانی سول وفوجی اہلکاروں کی ایک فہرست تیار کر رکھی تھی جن پر غیر انسانی جرائم کا الزام تھا۔ ان ملزمان میں سے ایک راؤ فرمان علی

تھا۔ بنگلہ دیشیوں کو ایک کاغذ کا ٹکڑا ملا تھا جس میں راؤ فرمان نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا، ''پاکستان کا سبز رنگ بنگلہ دیش کے سرخ میں بدل جائے گا۔'' بنگالیوں کے نزدیک اس کا مطلب قتل عام اور خون بہانے کی اجازت تھا۔ ہم نے راؤ فرمان علی سے اس بارے میں استفسار کیا جنہوں نے بتایا کہ ان کا اشارہ بنگلہ دیش کے جھنڈے میں سرخ رنگ کی جانب تھا اور ان کی مراد خون بہا ہرگز نہ تھی۔ ہم نے بنگالیوں کو ان کی وضاحت سے آگاہ کیا جس پر بظاہر وہ مطمئن تھے۔

دورے کے دوران بھٹو کو سوار (SAVAR) کے مقام بھی لے جایا گیا۔ جہاں 1971ء میں آزادی کی لڑائی میں جاں بحق بنگالیوں کی یادگار قائم کی گئی تھی۔ بھٹو خاموشی سے کھڑے رہے اور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے سے گریز کیا۔ پروٹوکول چیف نذرالاسلام نے بھٹو کو یادگار پر رکھنے کے لیے پھول تھمائے، بھٹو کو بازو سے پکڑ کر آگے کیا، بھٹو نے وہ پھول یادگار کے اوپر رکھ دیے۔

بھٹو کی واپسی پر متوقع جم غفیر کو مدنظر رکھتے ہوئے بنگالی حکومت نے ہوائی اڈے جانے والی سڑک پر کرفیو نافذ کر دیا۔ اس کے باوجود بڑی تعداد میں لوگ آئے مگر انہیں سڑک سے دُور رکھا گیا۔ ہماری واپسی پی آئی اے کے اسی طیارے سے ہوئی جس میں بھٹو اور دیگر پاکستانیوں کو ڈھاکہ لایا گیا تھا۔

دفتر خارجہ میں میرا کام سقوط ڈھاکہ کے باعث پیدا ہونے والے مسائل کا حل تھا جو پاکستانی جنگی قیدیوں کی وطن واپسی کے بعد انجام کو پہنچا۔ اس کے بعد یہ ڈیسک تحلیل کرتے ہوئے مجھے ڈائریکٹر مغربی یورپ تعینات کر دیا گیا۔

ایوب خان نے پاکستانی معیشت بنائی تھی اور انہی کے دَور میں معاشی ترقی عروج پر تھی۔ بین الاقوامی اقتصادی و معاشی کمیونٹی کا اندازہ تھا کہ اس راستے پر چلتے ہوئے مناسب عرصہ میں ہی پاکستان معاشی خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔

صدر پاکستان کا حلف لیتے ہی بھٹو نے متعدد صنعتی یونٹس، بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور دیگر اداروں کو قومیانے کا حکم صادر کر دیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ وزیر معاشیات

ڈاکٹر مبشر حسن کے کہنے پر کیا جنہیں اس عہدے کا ماضی کا کوئی تجربہ نہیں تھا جس پر وہ براجمان تھے۔ پاکستانی معیشت پر اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے اور آج بھی ہم صرف اس ایک اقدام کے باعث مسائل کا شکار ہیں۔ قومیائے گئے اداروں کی سربراہی افسر شاہی، نجی تعلقات اور معاشرے کے مختلف شعبوں سے وابستہ ایسے لوگوں کو دی گئی جنہیں صنعتی و کاروباری تجربہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ صنعتیں زبوں حالی کا شکار ہونے لگیں۔ بٹالہ انجینئرنگ کمپنی (BECO) جیسے بڑے ادارے تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے۔ بے ایمان اور نالائق مینیجرز اس تباہی کے ذمہ دار تھے۔ اس گمبھیر صورتِ حال کو کرپشن اور لوٹ مار نے مزید گھنا دیا۔

سیاسی بنیادوں پر قرضے لیے جاتے جو بعد میں معاف ہو جاتے جس کے نتیجہ میں قومیائے گئے بینک بھی تباہ ہو گئے۔ کئی برسوں تک قومیائے گئے اقتصادی یونٹس کو نجی کاروباری حلقوں میں انتہائی سستے داموں فروخت کیا جاتا رہا جس سے ملکی معیشت کو مزید نقصان اٹھانا پڑا۔

اقتدار میں آتے ہی بھٹو نے یہ حکم بھی دیا کہ کوئی صنعتکار اور بزنس مین بیرونِ ملک نہیں جائے گا جس کے بعد ان کے پاسپورٹ سرکاری تحویل میں لے لیے گئے۔ اطلاعات کے مطابق ڈپٹی سیکریٹری احمد صادق نے گندھارا انڈسٹریز کے چیئرمین جنرل حبیب اللہ کو بیرون ملک روانگی کا اجازت نامہ جاری کیا۔ بھٹو نے اس کی پاداش میں احمد صادق کو معطل کر دیا۔ کسی نے کابینہ میٹنگ میں یہ سوال اٹھاتے ہوئے کہا بھٹو تو قانون کی حکمرانی پر یقین رکھتے تھے جب کہ احمد صادق کی معطلی اس کے برعکس ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھٹو نے فوراً ہی سختی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ کون قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہے، میں تو نہیں رکھتا۔ جب ضیا نے حکومت سنبھالی تو میں نے احمد صادق کی سفارش کی۔ ضیا نے میری بات مان لی اور احمد صادق کو بحال کر دیا گیا۔ بعدازاں احمد صادق بینظیر کے پرنسپل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ احمد صادق ہمارے پاس اس وقت جرمنی آئے جب میں وزیر کے عہدے پر فائز تھا۔

چینی وزیراعظم چواین لائی نے 1954ء میں بٹالہ انجینئرنگ کا دورہ کیا تھا۔ ان کی واپسی پر چینی انجینئر کئی برسوں تک وہاں تربیت لینے آتے رہے۔ بیکو کا چپہ چپہ قومیایا گیا تھا۔ بائی سائیکل یونٹس جو نیشنلائزیشن آرڈیننس میں نہیں آتے تھے، وہ بھی قومیائے گئے۔ اس کی وجہ ڈاکٹر مبشر حسن کا بیکو کے مالک اور میرے سسر سی ایم لطیف سے ذاتی عناد تھی۔

ڈاکٹر مبشر حسن کو میک لیگن انجینئرنگ کالج سے نکالا گیا تھا، انہوں نے پھر (BECO) میں نوکری کی درخواست دی جس کے باعث بیکو کے جرمن نژاد جنرل مینیجر نے فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر مبشر حسن نے بیکو میں جس عہدہ کے لیے درخواست دی ہے، وہ اس کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔ اگرچہ سی ایم لطیف کے علم میں یہ بات نہیں تھی تاہم مبشر حسن نے بیکو اور ان کے خلاف عناد قائم رکھا۔

سی ایم لطیف دوسری جنگ عظیم کے بعد اس برطانوی وفد کے رکن کی حیثیت سے جرمنی گئے تھے جسے وہاں سے جنگ کے خاتمہ پر مشینری واپس لانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہیں اس وقت بریگیڈیئر کا عہدہ اور یونیفارم دیا گیا جب سینئر ترین پاکستانی افسر ایوب خان لیفٹیننٹ کرنل تھے۔

ڈاکٹر مبشر حسن بیرون ممالک دوروں کے شوقین تھے اور سرکاری دوروں کی آڑ میں اپنا شوق پورا کرتے۔ انہیں دوروں کے دوران ماتحت عملے سے ناروا سلوک کی بری عادت بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر انہیں معطل کر دیتے تھے۔

وہ دو ملکی اقتصادی معاملات کے لیے رومانیہ گئے۔ دفتر خارجہ کی نمائندگی ڈائریکٹر مشرقی یورپ ابوالفضل کو کرنی تھی جو رومانیہ سے تعلقات کے ذمہ دار بھی تھے۔ جب انہیں علم ہوا کہ وہ ڈاکٹر مبشر حسن کے ساتھ جائیں گے جنہیں افسران معطل کرنے کی عادت ہے تو ان پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ آغا شاہی کے پاس بھاگے بھاگے گئے اور درخواست کی کہ ان کی جگہ وحید یعنی مجھے بھیج دیا جائے کیوں کہ میں ڈائریکٹر مغربی یورپ تھا اور اس کے سوا کوئی متبادل بھی نہ تھا۔ آغا شاہی نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ آیا میں ڈاکٹر

مبشر حسن کے ساتھ رومانیہ جانے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لیے سوچا اور پھر ہامی بھر لی۔

ڈاکٹر مبشر حسن کے ساتھ رومانیہ جانا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ تاہم میں نے نتائج کی پرواہ کیے بغیر حالات سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ہماری منزل بخارسٹ سے پہلے روم کا سٹاپ تھا جہاں سے ہم نے رومانیہ کے لیے پرواز کی۔ ایک پاکستانی جو بظاہر کمیشن ایجنٹ معلوم ہوتا تھا، ہمارے ساتھ طیارے میں سوار ہوا اور بخارسٹ ایئر پورٹ سے اپنی منزل پر روانہ ہوا۔ وہ وقفے، وقفے سے ڈاکٹر مبشر حسن سے ملتا۔ ڈاکٹر مبشر حسن صنعتکاروں اور بزنس مین سے اس بنیاد پر اظہار لاتعلقی کرتے کہ ان پر کسی کو فائدہ دینے کا الزام نہ آئے۔

رومانیہ اور پاکستان میں اشیا کے تبادلے (BARTER DEAL) کی بنیاد پر تجارتی معاہدہ تھا۔ پاکستان نے اپنا وعدہ پورا کیا جب کہ رومانیہ کی حکومت پاکستان کو سامان کی ترسیل میں پیچھے رہ گئی۔ قرضے کی رقم کئی ملین ڈالر تھی۔ رومانیہ پاکستان کو رقم ادا کیے بغیر پاکستان سے مزید تجارت کا خواہاں تھا۔ مذاکرات کے دوران رومانیہ نے پاکستان میں ٹریکٹر فیکٹری، ٹرک اور دیگر صنعتی یونٹس لگانے کی پیشکش کی۔ اس کے بدلے میں وہ چاہتے تھے کہ پاکستان انہیں ہنگامی بنیادوں پر کپاس اور دیگر سامان دے جس کی مالیت لاکھوں ڈالرز تھی۔ صنعتی یونٹس کی تعمیر دیر پا مرحلہ تھا جب کہ پاکستان سے سامان قلیل وقت میں برآمد کیا جا سکتا تھا جس کا مطلب تھا کہ بغیر فوری فائدے کے رومانیہ پر مزید رقم صرف کی جائے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کا خیال تھا کہ من و سلویٰ اترنے والا ہے اور پاکستان جلد صنعتی ملک بن جائے گا۔ رومانیہ کی پیشکش پر غور کرتے ہوئے ان کے چہرے پر خوشی عیاں تھی۔ منسٹری آف کامرس کے جوائنٹ سیکریٹری مسعود زمان بھی وفد کے رکن تھے اور فوراً ہی رومانیہ کا مقصد سمجھ گئے۔ انہوں نے رومانیہ کے ذمہ پاکستان کی کثیر رقم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مزید پیش رفت سے قبل رومانیہ کو بقایا جات ادا کرنے ہوں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ رومانیہ اور پاکستان آئی ایم ایف کے رکن کی حیثیت سے

بارٹر معاہدہ نہیں کر سکتے۔ مزید کوئی بھی معاہدہ بین الاقوامی طور پر روپے سے تبدیل کی جانے والی کسی بھی کرنسی میں کیا جائے اور عام کاروباری ادائیگیوں کے رائج طریقہ کار کے مطابق رقم ادا کی جائے۔ مسعود زمان کی مداخلت نے رومانیہ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور مذاکرات بے نتیجہ رہے۔ ڈاکٹر مبشر حسن اس جادو کی چھڑی کے بغیر ہی لوٹے جو پاکستان میں راتوں رات صنعتوں کا جال بچھا دیتی۔ میرے اور ڈاکٹر مبشر حسن کے تعلقات ٹھیک رہے۔ شاید انہیں ادراک ہو چکا تھا کیوں کہ میں دورانِ سفر کسی موقع پر پریشان نہیں ہوا۔

جب جولائی 1972ء میں ویانا سے اسلام آباد پہنچا تو جنرل رضا سیکریٹری ایڈمنسٹریشن تھے۔ انہوں نے برطانوی ہائی کمشنر کے لیے الوداعی عشایئے کا اہتمام کیا۔ عشائیہ کے دوران جنرل رضا کی آنکھ لگ گئی اور وہ خراٹے لینے لگے جس سے محفل زوردار قہقہوں سے گونج اٹھی۔

برطانوی ہائی کمشنر کی جانب سے الوداعی تقریب میں وزیرِ مملکت برائے دفاع اور خارجہ امور عزیز احمد نے ہائی کمشنر سے پوچھا کہ کیا وہ ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری طور پر کہیں تعینات ہوں گے۔ انہوں نے جواب دیا، ''عزت مآب، میرے ملک میں ریٹائرمنٹ کی عمر 60 سال ہے جس کے بعد کوئی بھی شخص ریاستی عہدہ نہیں رکھ سکتا۔'' عزیز احمد کے دفتر میں ڈائریکٹر سعید دہلوی نے مجھے بتایا کہ اس روز عزیز احمد کی 70 ویں سالگرہ تھی۔ میں نے سعید سے پوچھا کہ آیا مجھے سالگرہ مبارک کہنا چاہیے۔ اس نے منع کرتے ہوئے کہا کہ میرے باس برا مان جائیں گے کیوں کہ وہ خود کو ہمیشہ 50 سال کا تصور کرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سرکاری اہلکار مطاہر حسین میرے افسر بنے۔ وہ بہت نرم مزاج شخص اور انتہائی عمدہ انگریزی لکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں تلخ تجربہ ہوا تھا کہ ان کی بنگالی بیوی انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک فرانسیسی خاتون سے شادی کی۔ ایک دن انہوں نے ہم سے کہا کہ ایک عورت اور مرد میں

رشتہ قائم نہیں رہ سکتا اگر وہ شادی نہ کریں۔ انہوں نے فوراً ہی یہ بھی کہہ دیا کہ کوئی ایسا رشتہ نہیں جس کا انجام نہ ہو۔ ہم دونوں کے خاندان ایک دوسرے کے ساتھ اسلام آباد کے مضافات میں پکنک کے لیے جاتے جو اس وقت تک سرسبز و شاداب تھے۔ مطاہر حسین، مشرقی جرمنی میں پاکستان کے سفیر تعینات ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد میں بون میں وزیر تعینات ہوا۔ میں جب بھی مغربی برلن گیا تو مشرقی برلن میں ان سے ضرور ملنے جاتا۔ وہ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکے تھے مگر صدر ضیاالحق نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے ان کی مدت ملازمت میں تین سال اضافہ کر دیا۔

ڈائریکٹر جنرل سلیم الزمان بھی مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے اور میں نے دفتر خارجہ میں ان کے زیر سایہ بھی فرائض انجام دیئے۔ جب میں بون میں سیکنڈ سیکریٹری تھا تو وہ فرسٹ سیکریٹری تھے۔ ہمارے اس قدر قریبی تعلقات تھے کہ ہم ایک دوسرے کو فیملی کا حصہ سمجھتے۔ ایڈیشنل سیکریٹری خارجہ شاہ نواز اور ایڈیشنل سیکریٹری ایڈمنسٹریشن مفتی عباس مجھ سے اپنے گھر والوں جیسا سلوک کرتے۔

شہریار خان کا کویت سے اسلام آباد تبادلہ ہوا۔ بحیثیت باس ان کی شہرت اچھی نہ تھی۔ وہ ماتحت افسران سے ناروا سلوک رکھتے۔ ایک روز آغا شاہی نے مجھے بلا کر کہا کہ ڈی جی شہریار چاہتے ہیں کہ تم بحیثیت ڈائریکٹر افریقہ ان کے زیر سایہ کام کرو۔ میں نے جواب دیا، ''سوری، رانگ نمبر۔'' انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا، ''میں ایک اور انور مراد کے زیر سایہ کام نہیں کرنا چاہتا۔''

مسز خورشید حیدر اس وقت ڈائریکٹر جنرل یورپ تعینات ہوئیں جب میں ڈائریکٹر ویسٹرن یورپ کے عہدہ پر تھا۔ جب انہوں نے عہدہ سنبھالا تو میں چھٹیوں پر لاہور تھا۔ انہوں نے مجھے فون کیا اور فوری اسلام آباد آنے کا کہا۔ میرے پاس ان کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسلام آباد واپسی کے ایک دن بعد ہی مجھے بیسویں گریڈ میں ترقی اور ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ ساتھ سینیگال کے قائمقام وزیر کا عہدہ بھی مل گیا۔ میں نے نیا عہدہ سنبھالتے ہی مسز خورشید حیدر کے ساتھ کام کرنے سے انکار

کر دیا۔ وہ فوراً ایڈیشنل سیکریٹری مفتی عباس کے پاس پہنچیں جنہوں نے مجھے بھی ان کی موجودگی میں بلا لیا۔ میں نے مفتی عباس سے کہا کہ انہوں نے خودی میرے پروموشن آرڈرز ایشو کیے ہیں اور اب میں ڈائریکٹر ویسٹرن یورپ نہیں رہا۔ مفتی عباس نے خورشید حیدر سے کہا کہ اب انہیں نیا ڈائریکٹر ویسٹرن یورپ ڈھونڈنا پڑے گا۔

جنرل رضا کو بطور سیکریٹری ایڈمنسٹریشن پُرمزاح ترکیب سوجھی اور انہوں نے دفتر خارجہ میں حاضری ریکارڈ بناتے ہوئے اس پر ہر ایک کی حاضری لگانا لازم کر دیا۔ دفتر خارجہ میں زیادہ تر افسران اور دیگر سٹاف دیر تک کام کرتا تھا لہٰذا تقریباً سب نے سردار شاہ نواز خان کے زیر قیادت حاضری ریکارڈ کا بائیکاٹ کر دیا۔ دفتر خارجہ میں ایک خفیف بغاوت اٹھی جس کی اطلاع فوراً بھٹو تک پہنچی۔ معاملے کی نوعیت سمجھتے ہوئے انہوں نے فوراً حاضری ریکارڈ ختم کرنے کا حکم دیا۔

ڈاکٹر مبشر حسن نے وزیر معاشیات کا عہدہ سنبھالتے ہی پبلک ٹرانسپورٹ کے عدم وجود کو نظرانداز کرتے ہوئے گاڑیوں کی درآمد پر پابندی لگا دی۔ اس وقت کار ہی نقل وحمل کا واحد ذریعہ تھی۔ ویانا سے اسلام آباد واپسی پر مجھے اپنی استعمال شدہ گاڑی درآمد کرنے کی اجازت لیتے مہینے لگ گئے۔ سیکریٹری کامرس اعجاز نائیک نے مجھے درآمدی اجازت نامہ دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

برطانوی ہائی کمشنر ایک روز دفتر خارجہ آئے اور وزیر برائے مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے دفتر خارجہ کے ذریعے برطانوی ویزہ کے حصول کے لیے جو فہرست بھیجی ہے ان میں کچھ اَن پڑھ لوگ بھی شامل ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے لندن میں اسلامک آرٹ فیسٹیول میں شریک ہونا تھا۔ سرکاری اہلکاروں کے علاوہ انہوں نے ایسے افراد کے نام بھی شامل کر دیئے جو غیر قانونی طور پر برطانیہ رہنا چاہتے تھے۔ آغا شاہی کو برطانوی ہائی کمشنر سے معذرت کرنا پڑی اور ایسے تمام افراد کے نام فہرست سے خارج کر دیئے گئے۔

دفتر خارجہ میں بحیثیت ڈائریکٹر تعیناتی کے دوران میں اسلام آباد کلب کی

ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن اور بعد ازاں اسلام آباد گالف کلب کا صدر منتخب ہوا۔ گالف کلب خستہ حال اور کسی جنگل کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ ہمیں اسے گالف کورس کی شکل دینے میں خاصی محنت کرنا پڑی۔ اتفاق سے 38 سال کی عمر میں، میں اسلام آباد گالف کلب کا کم عمر ترین صدر تھا۔ میرے سے پہلے اور بعد کے زیادہ تر صدور 60 یا 70 سال کے قریب ہوتے۔

1973ء میں پورا ملک تباہ کن سیلاب کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہم جنگی قیدیوں کی وطن واپسی کے سلسلہ میں دہلی تھے۔ بھٹو نے ہمیں اسلام آباد کی بجائے سکھر بلایا جہاں ہم نے فضا سے سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھیں۔ واپسی پر ہمیں علم ہوا کہ ہماری غیر موجودگی میں پاکستان خارجہ سروس کا ٹائٹل ختم کر دیا گیا تھا۔ بھٹو نے سیلاب کے دوران افسر شاہی کی بد انتظامی پر برہم ہوتے ہوئے سول ملازمین کے ٹائیٹلز ختم کر دیے تھے۔

بھٹو کا دورہ پیرس

وزیر اعظم بھٹو اکتوبر 1975ء میں سرکاری دورہ پر پیرس گئے۔ ڈائریکٹر مغربی یورپ کی حیثیت سے میں وفد کا حصہ تھا۔ دوران سفر ہم نے ایک رات کوپن ہیگن گزاری جہاں سے پیرس روانہ ہوئے۔ مجھے بھٹو کے دورہ کی بریف بنانے کی ذمہ داری دی گئی۔ پیرس میں کونسلر اور میرے ہم جماعت احمد کمال نے دوطرفہ تعلقات پر کارآمد معلومات بھیجنے کی بجائے ہمیں فرانسیسی ادارہ برائے سیاحت کے کتابچے بھیج دیئے۔

بھٹو کے دورہ کا مقصد سیر و تفریح نہیں بلکہ فرانسیسی قیادت سے سنجیدہ دوطرفہ مذاکرات تھا۔ تاہم، ہم نے فرانس میں سفارتخانہ کی مدد کے بغیر مختصر و جامع رپورٹ تیار کی۔ ابوالفضل، جو مجھ سے ایک سال سینئر تھے، کی دو ہفتے قبل بحیثیت ڈائریکٹر جنرل مغربی یورپ ترقی ہوئی۔ بھٹو کو رپورٹ تیاری کے فوراً بعد بھیجی جانی تھی مگر ابوالفضل نے انہیں یہ رپورٹ طیارے میں دینے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ذاتی طور پر رپورٹ دینے سے وہ کوئی فائدہ بھی حاصل کر لیں گے۔ بھٹو بہت زیادہ پڑھنے اور کام وقت

برہونے کے عادی تھے۔ چوں کہ رپورٹ مقررہ وقت پر نہیں دی گئی تھی لہٰذا بھٹو برہم ہوئے۔ ابوالفضل نے ذمہ داری مجھ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ احمد کمال چالاک شخص تھا اور چیزیں اپنی حد تک رکھنے کی کوشش کرتا۔ فرانسیسی وزیر اعظم سے ملاقات کے دوران وہ میری جگہ وزارتِ خارجہ میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے شامل ہوا۔ مجھے منٹس آف میٹنگ لکھنا تھے۔ میں خوش تھا کہ مجھے پیرس میں ان مقامات کو دوبارہ دیکھنے کا موقع مل گیا جہاں 62-1961ء میں فرانسیسی زبان سیکھنے کے دوران گھوما کرتا تھا۔ میں نے احمد کمال کی بھیجی سیاحتی معلومات سے بھی خوب استفادہ کیا۔

بھٹو کا دورہ یادگار رہا کیوں کہ وہ فرانسیسیوں کو پاکستان میں نیوکلیئر فیول ری پروسیسنگ پلانٹ لگانے پر راضی کر چکے تھے۔ تاہم امریکی دباؤ کے باعث یہ منصوبہ حقیقت کا روپ نہ ڈھال سکا۔ فرانس نے ہمیں لاکھوں ڈالر کی وہ رقم بھی واپس نہ کی جو اس منصوبہ کے لیے پیشگی ادا کی گئی تھی۔

بھٹو نے کمال انداز میں فرانسیسی قیادت سے مذاکرات کیے جس کی انہوں نے بھی پذیرائی کی۔ انہوں نے فرانسیسی وزیر اعظم کے اعزاز میں استقبالیہ بھی دیا جس میں متعدد اہم شخصیات مدعو تھیں۔ انڈونیشی صدر سکارنو کی جاپانی اہلیہ رتنا دیوی بھی مدعو تھیں۔ وہ تقریباً نیم برہنہ ہی آگئیں جس پر پیرس میں سفیر ایم شفقت نے انہیں روکتے ہوئے ان کے کمر کے گرد اپنے بازو لپیٹے اور کافی دیر تک ایسے ہی رہے۔ بھٹو اس حرکت پر بہت نالاں ہوئے اور پروٹوکول چیف بریگیڈیئر (ر) اسماعیل قریشی سے کہا کہ سفیر سے کہیں وہ رتنا دیوی کو جانے دے۔ اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رتنا دیوی کے سفیر سے اچھے مراسم تھے۔ پروٹوکول چیف نے سفیر کو بھٹو کا پیغام پہنچایا لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔

ایم شفقت ایسا کر سکتے تھے کیوں کہ ان کی ریٹائرمنٹ میں چند ہفتے ہی باقی تھے اور وہ اپنی امریکی اہلیہ کو پہلے ہی نیو یارک بھیج چکے تھے۔ انہوں نے مدتِ ملازمت بڑھانے یا دوبارہ ملازمت کی درخواست بھی نہیں کی کیوں کہ وہ امریکہ میں نیا کیریئر

شروع کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

بھٹو کے زیر عتاب آنے والوں میں سے ایک آرمی ڈاکٹر کرنل محی الدین تھے۔ محی الدین کی بدقسمتی کے انہوں نے غیر ارادی طور پر کسی سے گفتگو کے دوران اپنی پشت بھٹو کی طرف کر لی۔ بعد ازاں انہیں آرمی میڈیکل کور کے ڈی جی اور لیفٹیننٹ جنرل کے عہدہ پر ترقی ہوگئی۔ ریٹائرمنٹ پر انہیں شیخ زید ہسپتال کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

ہم پیرس سے بخارسٹ (BUCHAREST) گئے جہاں چند دن قیام کے بعد پاکستان واپسی ہوئی۔ اس دورہ کے دوران بیگم نصرت بھٹو اور بینظیر بھٹو ہمارے ہمراہ تھیں۔ بینظیر بھٹو کی پورے دورہ کے دوران خود اعتمادی قابل ستائش تھی۔

ایشیائی مشترکہ سکیورٹی معاہدہ 1974ء

مشترکہ سکیورٹی معاہدے کا خیال 60 کے عشرے کے آخری برسوں میں برزنیف کو آیا جس پر کافی عرصہ تک سوچ بچار کی گئی۔ 70ء کی دہائی کے وسط میں بھٹو نے اپنی صاحبزادی بینظیر کو اس پر غور کرنے اور تجاویز دینے کی ذمہ داری سونپی۔ بینظیر نے انتہائی شاندار تجاویز تیار کیں جن میں دلائل سے ثابت کیا کہ پاکستان کو یہ معاہدہ نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس طرح ہم سوویت یونین کو براستہ پاکستان اور بھارت، بحیرۂ عرب کے گرم پانی تک رسائی دیں گے۔ ان کی تجاویز اس حوالے سے حکمت عملی کی بنیاد بنیں۔ بھٹو زیرک تھے اور خارجہ امور کی سمت کا اندازہ وقت سے بہت پہلے لگا لیتے۔

اسلام آباد میں عراقی سفارتخانہ کے ذریعے ہتھیاروں کی تقسیم

عراقی حکومت کے سوویت یونین سے قریبی تعلقات تھے اور وہ دیگر ممالک میں سوویت کی تخریبی کارروائیوں میں بھی معاون ہوتی۔ ایک دن دفتر خارجہ کے قریباً تمام عملہ کو پریس بریفنگ کے لیے بلایا گیا۔ اسلام آباد میں عراقی سفارتخانہ سفارتی سامان میں اسلحہ درآمد کر رہا تھا جو بلوچستان میں باغیوں کو دیا جاتا تھا۔ سفارتخانہ کو اس

وقت رنگے ہاتھوں پکڑلیا گیا جب عراقی سفیر سے پوچھا گیا کہ سفارتی بستوں میں کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اس میں کتابیں ہیں۔ اس کی موجودگی میں سفارتی بستے کھولے گئے جن سے ہتھیار برآمد ہوئے۔ یقیناً ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

افغانستان سے تعلقات میں بہتری

بھٹو کو افغانستان سے بہتر تعلقات کا ادراک ہوا۔ ظاہر شاہ کا رشتہ دار اور اندرونی طور پر افغانستان میں طاقت کا سرچشمہ سردار داؤد تھا۔ اس نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کی اور اسے روم جلا وطن کرتے ہوئے افغانستان میں حکومت بنالی۔ درحقیقت روسیوں کے برسوں پرانے منصوبوں کا ادراک کیے بغیر سوویت یونین کو افغانستان کی راہ دکھانے والا بھی وہی تھا۔

داؤد نے بھٹو کی دعوت قبول کی اور اسلام آباد آیا جہاں اس کا شان دار استقبال کیا گیا۔ پہلی بار خارجہ سروس کے افسران کو افغان سفارتکاروں سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کی ہدایت ملی۔ خارجہ سروس کے قریباً تمام افسران کو سردار داؤد کے اعزاز میں دعوت پر بلایا گیا اور افغان وفد سے دوستانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی۔ سوویت یونین کے لیے یہ نا قابل برداشت تھا اور انہوں نے سردار داؤد کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنایا جس کے نتیجہ میں وہ افغان سوشلسٹوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ جنرل ضیاالحق نے بھی سردار داؤد کو دعوت میں بطور چیف آف آرمی سٹاف شرکت کی۔ میں نے نیاز اے نائیک کو ان سے متعارف کرانے کی کوشش کی مگر نائیک، بھٹو سے اتنا خائف تھے کہ کترا گئے۔

جے اے رحیم کی پٹائی

جے اے رحیم وفاقی وزیر اور پیپلز پارٹی پاکستان کے سیکریٹری جنرل بھی تھے۔ ان کا ایوانِ وزیر اعظم میں عشائیہ کے دوران بھٹو سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ کھانا لگنے

میں دیر ہو رہی تھی، لہٰذا جے اے رحیم غیر اخلاقی جملے کہہ کر بغیر ڈنر کیے چلے گئے۔ رات کو وفاقی سکیورٹی فورس کے چند اہلکار جے اے رحیم کی رہائش گاہ پر گئے اور ان کی پٹائی کر دی۔ جے اے رحیم نے سابق خارجہ سروس افسر اور جرمن زبان بولنے والے افسر مسٹر اکمت کو فون پر ایف ایس ایف کے ہاتھوں پٹائی کا بتایا۔ انٹیلی جینس بیورو نے یہ کال ریکارڈ کر لی کیوں کہ گفتگو جرمن زبان میں تھی، لہٰذا اسے انگریزی میں ترجمہ کرانے کی ضرورت تھی۔ یہ سن کر کہ میں جرمنی میں خدمات انجام دے چکا ہوں، آئی بی کے دو افسران اسلام آباد میں میری رہائش گاہ پر آئے اور درخواست کی کہ میں اس ریکارڈنگ کا ترجمہ کروں کیوں کہ یہ قومی مفاد کا اہم معاملہ ہے۔ میں نے ریکارڈنگ سنی جس میں جے اے رحیم، مسٹر اکمت کو اپنی پٹائی کا احوال بتا رہے تھے۔ اس میں قومی مفاد جیسا کچھ نہ تھا لہٰذا میں نے انگریزی میں ترجمہ سے انکار کر دیا۔

جنرل ضیاالحق مارچ 1976ء میں چیف آف آرمی سٹاف بنے۔ سب جانتے تھے کہ جنرل ضیاالحق اور ان کی اہلیہ میرے فرسٹ کزن ہیں۔ ڈی جی آئی بی اکرم شیخ اور ایف ایس ایف کے سربراہ مسرور حسن علیحدہ علیحدہ میرے پاس آئے اور جنرل ضیاالحق کی جاسوسی کا کہا۔ مجھے واشنگٹن ڈی سی میں تعیناتی کا لالچ دیا گیا۔ میں نے دونوں کو انکار کر دیا جس پر وہ ناخوش لوٹ گئے۔

مارگریٹ تھیچر کا دورۂ پاکستان

مارگریٹ تھیچر نے برطانوی کنزرویٹو پارٹی کی سربراہ کی حیثیت سے پاکستان کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار بھی تھے۔ اس وقت عرصہ دراز سے لیبر پارٹی اقتدار میں تھی۔ بحیثیت ڈائریکٹر مغربی یورپ، مجھے ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دفتر خارجہ نے بھٹو کو تجویز دی کہ انہیں پورا پروٹوکول دیا جائے کیوں کہ ہمارے خیال سے وہ انگلینڈ کی اگلی وزیراعظم تھیں۔ بھٹو نے ہماری تجویز اس بنیاد پر رد کر دی کہ برطانوی پارلیمان میں لیبر پارٹی کی اکثریت ہی متوقع ہے۔ مارگریٹ تھیچر متوقع

پروٹوکول سے بے پرواہ تھیں۔ اسلام آباد سے باہر میں انہیں ٹیکسلا لے کر گیا جہاں عجائب گھر میں گندھارا تہذیب کی چیزیں دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئیں۔

دفتر خارجہ کی بے حد کوشش کے بعد بھٹو ان کے اعزاز میں تقریب کی میزبانی پر راضی ہوئے۔ اس تقریب میں بینظیر بھی اپنے نوجوان ساتھیوں کے ہمراہ شریک تھیں، ان سب نے جینز پہن رکھی تھی۔

مارگریٹ تھیچر برطانیہ کی وزیراعظم بنیں اور اس عہدہ پر کافی عرصہ رہیں۔ جب انہوں نے اقتدار سنبھالا تو برطانوی معیشت زبوں حالی کا شکار تھی۔ یہ اعزاز ان کی حکومت کو ہی جاتا ہے جس نے انگلینڈ کو معاشی خوش حالی پر گامزن کیا۔

1974ء میں بھٹو نے حکم دیا کہ خارجہ سروس میں گریڈ 19 سے 20 میں ترقی کے لیے امتحان دینا ہوگا۔ دس نشستوں کے لیے 13 افسران نے امتحان میں شرکت کی۔ ہمارا بیج سب سے کم عمر تھا لیکن ہم سب کامیاب ہو گئے۔ سینئر بیج کے تین افسران ناکام رہے۔ اس کے باوجود ان تینوں نے کسی طرح ترقی پالی اور ہمیں مزید ڈیڑھ سال کے لیے انتظار پر مجبور کیا۔ اس دوران سیکریٹری خارجہ علوی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اوٹاوا، کینیڈا میں پاکستانی سفارتخانہ میں کونسلر کی حیثیت سے تعینات ہو جاؤں۔ میں نے کہا کہ سر میں تو اوٹاوا کا نام سن کر سردی سے کانپنے لگ گیا ہوں۔ پھر انہوں نے مجھ سے کینبرا تعیناتی کا پوچھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کینبرا کہاں ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کہاں ہے۔ مسٹر علوی نے بتایا کہ یہ آسٹریلیا کا دارالحکومت ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میرا کینبرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں کیوں کہ یہ پاکستان سے بہت فاصلے پر ہے۔

یہ وہ دور تھا جب میں گریڈ 19 سے 20 میں ترقی کے لیے خالی آسامی کا منتظر تھا۔ وزارت نے مجھے ڈپٹی سیکریٹری جنرل CENTO (سینٹو) تعینات کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی سینٹو ممالک اور امریکہ سے کلیئرنس کا مرحلہ مکمل ہوا، بھٹو نے تعیناتی منسوخ کر دی۔ بیگو کے قومیائے جانے پر میرے سسر ڈی نیشنلائزیشن کے معاملہ پر مسلسل تنقید کرتے تھے۔ مسٹر شاہی نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور بتایا کہ بھٹو نے میری کونکری

گنی (CONAKRI GUINEA) تعیناتی کا حکم دیا ہے۔اس وقت کونکری گنی کے صدر سیکوتوری تھے جنہوں نے اپنی بدانتظامی کے باعث ملکی معیشت کا بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ میں نے مسٹر شاہی پر واضح کر دیا کہ چاہے نتائج کچھ بھی ہوں، میں کونکری نہیں جاؤں گا۔ شاہی نے پوچھا کہ پھر کیا کرو گے۔ میں نے کہا کہ میری دو سال کی رخصت پڑی ہے میں اسے استعمال کرلوں گا۔ میرے جواب سے آغا شاہی پریشان ہو گئے۔

دلائی کیمپ

1970ء کے وسط سے پہلے پاکستانی سیاح تین ماہ کے لیے ویزہ لیے بغیر مغربی یورپ کے ممالک میں سیاحت کر سکتے تھے۔اس کے بعد پاکستانیوں نے وہاں نوکریاں اور پناہ لینا شروع کر دی جس کے نتیجے میں تمام ممالک نے ویزہ کی پابندی شروع کر دی۔

پی آئی اے کے فضائی عملہ کے لیے فرانسیسی ویزہ کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ فرانسیسی حکام پی آئی اے عملہ کے لیے ویزہ جاری کر چکے تھے جب کہ پاکستانی حکام نے ایئر فرانس کے عملہ کے لیے ویزہ میں دیر کر دی۔ اسلام آباد میں فرانسیسی سفارتخانہ ایئر فرانس کے عملہ کو ویزہ دینے کے لیے دفتر خارجہ پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ ڈائریکٹر مغربی یورپ کی حیثیت سے میں نے وزارتِ داخلہ کے جوائنٹ سیکریٹری عبدالحمید سے رابطہ کیا تاکہ اس مد میں احکامات جاری ہو سکیں۔ حمید اچھا دوست تھا لیکن میں نے جب بھی اس سے ملاقات کی کوشش کی تو اس کے دفتر سے وقت نہ ملتا یا آخری لمحے میں ملاقات منسوخ ہو جاتی ۔ اس رویہ سے تنگ ہو کر میں نے اس سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ایئر فرانس کے عملہ کو جلد ویزہ دلانے کا کہا ورنہ پی آئی اے کے عملہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ حمید نے تب مجھے بتایا کہ ایف ایس ایف نے بھٹو کی پارٹی سے باغی افراد کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر پہنچا دیا ہے۔اس وجہ سے عدالت عظمیٰ بہت خفا تھی اور وزارتِ داخلہ کو بار بار عدالت حاضری کے دوران غائب کیے جانے والے افراد بارے

بتانا پڑتا۔ پولیس ان لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کے کپڑے لے جاتی۔ انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ انہی وجوہات کی بنا پر وہ مجھ سے مل نہیں پا رہا اور ہماری ملاقات آخری لمحات میں منسوخ ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے غائب کیے گئے افراد کے رشتہ دار اپنے پیاروں کی واپسی کے لیے عدالت عظمیٰ سے رابطہ کر چکے تھے۔

جولائی 1977ء میں ضیاالحق کے ہاتھوں بھٹو حکومت کے خاتمہ پر یہ افراد آزاد کشمیر کے دلائی کیمپ سے برآمد ہوئے۔ چوں کہ آزاد کشمیر عدالت عظمیٰ کے اختیار سے باہر تھا لہٰذا اس حوالے سے کوئی قانونی کارروائی عمل میں نہ آسکی۔

بھٹو کا دورۂ جرمنی

بھٹو نے 1976ء میں جرمنی کا سرکاری دورہ کیا جہاں انہیں فقید المثال استقبالیہ دیا گیا اور جرمن چانسلر شمدٹ (SCHMIDT) سے ان کی ملاقات بھی انتہائی سودمند رہی۔ واپسی پر بھٹو نے شمدٹ (SCHMIDT) کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ شمدٹ (SCHMIDT) نے بھٹو کی دعوت پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کے دورہ کی تاریخ سفارتی ذرائع کے ذریعے طے پائے گی۔ بھٹو کو اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے دفتر خارجہ کی جانب سے دی گئی سمری پر لکھا، اسے جہنم میں جانے دیں (LET HIM GO TO HELL)۔ ایسے ردِعمل کی کوئی وجہ نہ تھی۔

اگر کابینہ کا وزیر کسی سفیر کو بلا لیتا تو عموماً سیکشن افسران میٹنگ کے منٹس لکھتے۔ جب سفیر کو صدر یا وزیراعظم بلاتا تو منٹس کی ذمہ داری ڈائریکٹر کو دی جاتی۔ ایک روز وزیر برائے مذہبی امور مولانا کوثر نیازی اور برطانوی ہائی کمشنر کے مابین ملاقات کے لیے ایک خاتون سیکشن افسر کو منٹس کے لیے کہا گیا۔ میٹنگ کے بعد وزیر نے گفتگو کے لیے خاتون کو کچھ دیر اپنے پاس روک لیا۔ اس کے بعد وہ اسے فون کرتے اور ورغلاتے رہے۔ معاملہ آغا شاہی تک پہنچا تو انہوں نے بھٹو کے احکامات کے مطابق کابینہ کے وزیروں کے پاس منٹس کے لیے خواتین کو بھیجنے سے منع کر دیا۔

دفتر خارجہ، بھٹو کی کمزوری تھا۔ وزیر خارجہ بننے سے قبل وہ ایوب خان کی کابینہ میں وزیر برائے صنعتی امور تھے۔ وہ خارجہ سروس کے قریباً تمام افسران کو ان کے ناموں سے پکارتے تھے۔ موجودہ دفتر خارجہ دراصل اسلام آباد کے اکلوتے ہوٹل شہرزاد میں قائم کیا گیا۔ پاکستان نیوی بھی اس ہوٹل میں اپنا دفتر بنانا چاہتی تھی لیکن بھٹو دفتر خارجہ کی منتقلی کے حق میں نہ تھے، لہٰذا بحریہ کو آبپارہ میں دفتر مل گیا۔ سیکریٹری ایڈمنسٹریشن جنرل رضا کو ہوٹل کی تزئین وآرائش کی ذمہ داری سونپی گئی۔

1970ء کے انتخابات میں منتخب رکن قومی اسمبلی احمد رضا قصوری، وزیراعظم اور پیپلز پارٹی پر مسلسل تنقید کے بعد بھٹو کے پسندیدہ افراد کی فہرست سے خارج ہو گئے۔ بعد ازاں ان کے والد کو لاہور میں قتل کر دیا گیا۔ پھر تو پی پی پی سے وابستہ حلقوں نے بھی انہیں مکمل نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ وہ وقت گزارنے میرے پاس آ جاتے اور ہم اکٹھے ڈنر کرتے۔ یہ حقیقت کہ وزیراعظم بھٹو اور کبھی بھی خارجہ سروس کے افسران سے نالاں ہو سکتے تھے، مجھ پر اثر انداز نہ ہوتی۔ خارجہ سروس کے متعدد افسران بھٹو کے رویہ کے باعث ان سے کتراتے اور دُور رہنے میں ہی بھلائی سمجھتے۔ ہمارا ہی ایک ساتھی جو بعد میں وزیراعظم کا ڈائریکٹر برائے (میٹنگ) منٹس بنا، ہماری جاسوسی کیا کرتا تھا۔

نواں باب

داکار (سینیگال) میں بحیثیت قائم مقام سفیر تعیناتی

ایڈیشنل سیکریٹری خارجہ نیاز اے نائیک قریبی دوست تھے۔ مجھے کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تو ان سے صلاح لیتا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں وزارت میں مسلسل کام کرتا رہا تو بھٹو سخت اقدامات کر سکتے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں سینیگال کے دارالحکومت داکار تبادلہ پر راضی ہو جاؤں جو ان کے خیال سے مغربی افریقہ کا پیرس اور یورپ کے نزدیک تھا۔ ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے میں سینیگال چلا گیا اور بھٹو کا جولائی 1977ء میں صدر ضیاالحق کے ہاتھوں تختہ الٹنے تک نو ماہ گزارے۔

سینیگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ لوگ نرم مزاج اور رفاقت پسند ہیں۔ داکار خوبصورت شہر ہے جہاں مقامی آبادی کے علاوہ فرانسیسی اور لبنانی بھی رہتے ہیں۔ اس وقت لیوپولڈ سنگھور صدر اور عبدو دیوف (DIOUF) وزیراعظم تھے۔ آرمی چیف اور وزیر خارجہ مسلمان تھے۔ درباروں پر پاکستان کی طرح ہی جم غفیر ہوتا۔ سینیگال کے مسلمان بھی پاکستانیوں کی طرح پیری، مریدی اور درباروں کو مانتے ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ بھی بھرپور انداز میں منائی جاتی ہیں۔ ہر بالغ سینیگالی پر قربانی فرض ہے چاہے اسے ادھار، چوری یا بھیک مانگنی پڑے۔

میری داکار آمد سے قبل پاکستان اور سینیگال کے مابین تجارتی معاہدہ کا حتمی

مسودہ بن چکا تھا تاہم دستخط ہونا باقی تھے۔ پاکستانی حکام کا خیال تھا کہ سینیگالی حکومت معاہدہ بارے سنجیدہ نہیں۔ میں وزیر خارجہ آسانے سیک(ASANE SEK) سے ملا جنہوں نے بتایا کہ ان کی وزارت سے حتمی مسودہ گم ہو چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے ہم سے اس کی نقل مانگی اور یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ ماسوائے دوستانہ تعلقات پاکستان اور سینگال میں اور کوئی ٹھوس تعلقات نہیں تھے۔ میں اکثر سوچتا کہ ہم پیسے اور وقت کا ضیاع کر رہے ہیں کیوں کہ یہاں کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

ڈاکار میں سفارتخانہ نے میری رہائش کا بندوبست ہوٹل تیرانگا (خوش آمدید) میں کیا جو شہر کے وسط اور سفارتخانے کے بالمقابل تھا۔ یہاں میں نے چند ہفتے قیام کیا۔ تیرانگا بار بی کیو لنچ اور سوئمنگ پول کی وجہ سے مشہور تھا۔ لنچ کے بعد میں سوئمنگ پول پر ستانے گیا جہاں فرانسیسی اور لبنانی خواتین بھی لنچ کے بعد انتہائی مختصر لباس میں دھوپ سے لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔

ایران کے سفیر جو غیر شادی شدہ تھے، سینیگال سے قبل ہیمبرگ میں کونسل جنرل تھے۔ ہماری ملاقات کے دوران انہوں نے فرانسیسی اور لبنانیوں سے کم تعلقات ہونے کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا کہ سینگالی خواتین کے ساتھ گھومنے سے لوگ ان کے بارے میں باتیں کرنا شروع ہو جاتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تو ابھی آیا ہوں لہٰذا مجھے کوئی نہیں جانتا اور میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ تاہم یہ صورتِ حال زیادہ دیر برقرار نہیں رہی اور چند ہفتوں بعد ہی لوگ مجھے پہچاننے لگے۔

سینیگال کے ساحل فرانسیسی، جرمن اور یورپی سیاحوں میں مشہور تھے۔ کلب الدانیا(ALDIANA) اور کلب میڈیٹرینین (MEDITERRANEE) چھٹیاں گزارنے کے لیے مشہور ترین ریزارٹس میں شمار ہوتے تھے۔ چوں کہ ڈاکار میں رہائش ڈھونڈنا مشکل تھا، لہٰذا میرا زیادہ وقت ہوٹل میریڈئین میں گزرا جو ایئر پورٹ اور ساحل سمندر کے قریب تھا۔ ایک روز ترک، ایرانی، مصری اور دیگر دوست ممالک کے سفراء سے ہوٹل میریڈئین میں ملاقات کے دوران میں نے ان سے سینیگال کے اہم مقامات کے

بارے میں پوچھا۔ ان سب نے وہاں کئی سال قیام کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مجھے ڈاکار ہی رہنا چاہیے کیوں کہ دارالحکومت کے علاوہ سینیگال میں دیکھنے لائق کچھ نہیں۔ مصری سفیر جو جنسی مہم جوئی (CASSANOVA) کے دلدادہ تھے، نے مشورہ دیا کہ مجھے سوئمنگ پول کی بالائی منزل پر کمرا لے کر منظر سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ برہنہ گھومنے پھرنے کا رواج عام تھا اور زیادہ تر یورپی اسی مقصد کے لیے وہاں آتے۔

ڈاکار، مغربی افریقہ میں سلیو SLAVE ٹریڈ روٹ کے دہانے پر واقعہ تھا جہاں سے عرب، ہسپانوی اور یورپی تاجر غلاموں کو شمالی و جنوبی امریکہ لے جاتے۔ ایک روز میں نے گوری (GOREE) جزیرہ کا دورہ کیا جہاں سے بحری جہازوں کے ذریعے غلاموں کو لے جایا جاتا تھا۔ وہاں میری ملاقات سیاہ فام امریکیوں سے ہوئی جو اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین دیکھنے آئے تھے جنھیں غلامی کی زنجیروں میں باندھتے ہوئے امریکہ لایا گیا۔ وہاں موجود گائیڈ نے انتہائی اندوہناک قصے سنائے جس پر زیادہ تر سیاہ فام امریکی رو رہے تھے۔ غلاموں کی مختلف قیمتیں ہوتیں۔ خواتین اور نوجوانوں کی بالترتیب مردوں اور ادھیڑ عمر افراد سے زیادہ قیمت ہوتی۔ گائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ جب کوئی غلام بیمار پڑ جاتا تو اسے بحراوقیانوس میں پھینک کر شارکس کی خوراک بنادیا جاتا۔

ڈاکار کے سوا سینیگال میں معاشی ترقی دیکھنے لائق کچھ نہیں تھا۔ ڈاکار سے باہر کوئی شہر، شہر لگتا ہی نہ تھا۔ صحرائے صحارا کی پٹی پر واقع ممالک میں سے ایک ہونے کی وجہ سے سینیگال خشک سالی کا شکار رہتا جس کے باعث وہاں زندگی بہت مشکل تھی۔ حتیٰ کہ ڈاکار میں پانی کی کمی ہو جاتی۔ شہر کو جس پانی کی ترسیل ہوتی، اس میں مٹی زیادہ پائی جاتی تھی۔

اکثر زرعی فارم بہت چھوٹے تھے۔ کسانوں نے آبپاشی کے لیے چھوٹے گڑھے کھود رکھے تھے۔ مونگ پھلی اہم ترین زرعی اجناس میں شمار ہوتی۔

فرانسیسی شکار کے بہت شوقین تھے۔ برطانیہ کے برعکس فرانسیسیوں نے ہر جاندار کو شکار کیا جس کے باعث وہ ناپید ہونے کے قریب پہنچ گئے۔ سینیگال کے مشہور

ترین نیشنل گیم پارک ڈو ڈیجوج (PARC D.JUG) میں صرف دو ہرن اور دو CRANES باقی بچی تھیں۔ پارک کا وارڈن تمام سیاحوں کو کوئی اور جاندار نہ ہونے کے باعث دونوں جانداروں سے خصوصی طور پر متعارف کراتا۔ سینیگال میں سیاحت پر ایک کتاب کے سرورق پر ان دونوں (CRANES) کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ ایک روز ہوئس سفیر سے ملاقات کے دوران انہوں نے مجھے ایک سیاحتی کتاب کا سرورق دکھاتے ہوئے اس پارک میں جانے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے وہ پارک نہیں دیکھا تھا۔ جب انہیں علم ہوا کہ میں یہ پارک دیکھ چکا ہوں اور وہاں ان CRANES کے علاوہ کوئی پرندہ نہیں تو وہ حیران رہ گئے۔

بیشتر افریقی ممالک میں آزادی کی تحریک فسادات میں بدل جاتی جس سے بدامنی اور خون خرابہ ہوتا۔ اس کے برعکس سینیگال پر امن طور پر نوآبادی سے آزاد ریاست میں تبدیل ہوا۔ فرانسیسیوں نے سینیگال کے پہلے صدر لیوپولڈ سنگھور سے فرانسیسی نژاد جیسا سلوک کیا۔ وہ باعلم شخص تھے اور فرانسیسی زبان میں شاعری بھی کرتے۔ ڈاکار، سینٹ لوئی، کازامینس CASSAMANCE خوبصورت تفریح گاہیں تھیں جہاں پر دنیا بھر سے سیاح اکٹھے ہوتے۔ کلب میڈیٹرینی، کلب الڈیانا اور ہوٹل میریڈئین نے بحیرۂ اوقیانوس پر وسیع اور پرتعیش ریزارٹ قائم کر رکھے تھے۔ جرمن سفیر سے ملاقات کے دوران انہوں نے ان تفریح گاہوں کے باعث اپنے سفارتخانہ کو درپیش مسائل بتائے۔ سیاحوں میں سب سے زیادہ تعداد جرمنوں کی ہوتی تھی۔ وسط عمر کے جرمن، ڈاکار آتے ہی ان ریزارٹس میں پہنچتے اور برہنہ ہوکر موج مستی کرتے۔ ٹھنڈے ملک سے گرم ملک آتے ہی برہنہ گھومنے سے ان کے ڈھلتے جسم تپش برداشت نہ کر پاتے اور وہ شدید طبی مسائل کا شکار ہو جاتے۔ ان میں سے کچھ کو تو دل کا دورہ پڑ جاتا جو بعض اوقات جان لیوا ثابت ہوتا۔ جرمن سفارتخانہ ایسے افراد کو نازک یا مردہ حالت میں جرمنی منتقل کرنے کا پابند تھا۔ سفیر کا کہنا تھا کہ ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ ڈاکار سے پیرس تبادلہ ہو جائے۔ اگرچہ ایڈیشنل سیکریٹری

خارجہ نیاز اے نائیک میرے مفادات کا خیال رکھتے، تاہم بھٹو کا میرے سسری ایم لطیف کے خلاف رویہ رکاوٹ بن جاتا۔ پاکستان میں سیاسی مزاحمت کا اختتام 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاالحق کے ہاتھوں اقتدار سے محروم ہونے پر ہوا۔ اچانک مجھے وزارت سے ہدایات ملیں کہ میرا تبادلہ بون میں بطور وزیر ہو گیا جو میرے پیرس تبادلہ کی خواہش کے برعکس تھا۔ چوں کہ میں نیاز اے نائیک کے ساتھ بون میں تھرڈ اور سیکنڈ سیکریٹری کے طور پر خدمات انجام دے چکا تھا، لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پیرس کی بجائے بون جانا چاہیے، جہاں میں گزشتہ تجربات سے استفادہ کر پاؤں گا۔ 1977ء کے شروع میں کہوٹہ لیبارٹریز کا سامان لینے کا دفتر بون میں قائم ہو چکا تھا۔ اس دفتر کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ مجھے بون تبدیل کرنے کی سب سے بڑی وجہ پاکستان کا نیوکلیئر پروگرام تھا۔ ٹمبکٹو جو مالی میں واقع ہے، تاریخ میں کئی قصے کہانیوں کا مرکز رہا ہے۔ میں نے کچھ یورپی دوستوں کے ساتھ وہاں جانے کا بندوبست کیا تھا مگر بون تبدیلی ہونے سے یہ پروگرام منسوخ ہو گیا۔

ڈاکار میں ارجنٹائن کے قائمقام وزیر اوزولڈو برانا (OSVALDO BRANA) اچھے دوست اور ہمسایہ تھے۔ انہوں نے مجھے الوداعی عشائیہ دیا جو ساری رات جاری رہا۔ بار بی کیو میں ارجنٹائن سے گائے کا گوشت اور بحیرۂ اوقیانوس سے بڑے جھینگے دستیاب تھے۔ میں نے علی الصبح میزبان کو الوداع کہا، نہا کر کپڑے بدلے اور سیدھا ڈاکار ایئر پورٹ پہنچا۔

جس دوران میں سینیگال تعینات ہوا، اسی وقت اعجاز بخاری وہاں سیکنڈ سیکریٹری تعینات ہوا تھا۔ وہ ایک مشکل شخصیت کے طور پر جانا جاتا۔ وہ اکثر ساتھیوں سے لڑتا۔ ایڈیشنل خارجہ سیکریٹری ایڈمنسٹریشن مفتی عباس نے مجھے وزارت کی ہدایات دکھائیں جن کے مطابق اعجاز کا جنیوا سے ڈاکار تبادلہ کیا گیا تھا اور پوچھا کہ میں اس کا تبادلہ منسوخ کرانا چاہوں گا؟ ان کی خواہش تھی کہ اعجاز سے مڈبھیڑ کی بجائے میں پُرامن طریقے سے اپنا وقت گزاروں۔ میری اعجاز کے بارے میں کوئی ذاتی رائے نہ تھی، لہٰذا

میں نے مفتی عباس سے کہا کہ تبادلہ ہونے دیں۔ مجھے اعجاز کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا تھا، وہ اس کے برعکس بہت تابع، فرمانبردار، مددگار اور مخلص شخص تھا۔ ہماری بہت اچھی دوستی ہوگئی جو آج بھی قائم ہے۔ میں نے اس کی بہترین رپورٹ دی اور سفارش کی کہ اعجاز کے فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور انگریزی زبان پر عبور کے باعث اسے اقوام متحدہ میں ہمارے مشن میں اس کی پوسٹنگ ہونی چاہیے۔ نیاز اے نائیک جنیوا میں اعجاز کی تعیناتی سے قبل اقوامِ متحدہ کے یورپی ہیڈ کوارٹرز کے سفیر رہ چکے تھے۔ انہوں نے اعجاز کے خلاف انتہائی سخت الفاظ استعمال کیے جو میری رائے کے لیے مجھ تک پہنچے۔ میرا جواب تھا کہ اعجاز نے نیاز اے نائیک کے زیر سرپرستی کبھی کام نہیں کیا، لہٰذا نائیک کی رائے قصے کہانی پر منحصر ہے۔ میرے جواب پر اعجاز کے بارے میں منفی الفاظ حذف کر دیئے گئے۔

سینیگال کے وزیر اعظم عبدو دیوف مسلمان تھے۔ ان کی اہلیہ عمدہ گالفر اور ڈاکار گالف کلب کی صدر تھیں۔ ایک گالفر کی حیثیت سے مجھے ان سے اور ان کے خاوند سے ملاقات کے متعدد مواقع ملے۔ سینیگال کے چیف آف آرمی سٹاف مسلمان تھے۔ میں نے انہیں قرآن پاک کا تحفہ بھی دیا۔

ایک یونانی بحری جہاز نے پاکستانی عملہ کو ڈاکار بندرگاہ پر اتارتے ہوئے ان کا معاوضہ تک ادا نہ کیا۔ ہم نے بندرگاہ کے مینیجر سے درخواست کی جس نے جہاز کو اس وقت جانے کی اجازت نہ دی جب تک اس نے پاکستانیوں کو معاوضہ ادا نہ کر دیا۔

میں تین اطالوی پروفیسر صاحبان کے ساتھ متعدد دریا اور چھوٹی سی ریاست گیمبیا عبور کرتا ہوا سینیگال کے جنوب میں کاسامینس (CASSAMANCE) گیا۔ وہاں ایک رات قیام کے بعد ہم نے گنی بساؤ جانے کا منصوبہ بنایا جب کہ ہم میں سے کسی ایک کے پاس بھی وہاں کا ویزہ نہ تھا۔ راستے میں ہم نے کاجو خریدے اور گنی بساؤ میں امیگریشن افسران کو پیش کیے، جو ہماری معلومات کے مطابق انقلابی گارڈز کے اراکین تھے۔ انہوں نے ہمیں بارڈر پار کرنے دیا۔ گنی بساؤ نے کشت وخون کے بعد ر...ہگا

آزادی حاصل کی تھی۔ان میں سے ایک انقلابی نے مجھ سے پوچھا کہ میرا تعلق پرتگال سے ہے۔میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستانی ہوں اوران کی تحریک کا ہمیشہ ساتھ دیتا تھا۔

مشکل صورتِ حال بھانپتے ہوئے اور کم وقت کے باعث ہم نے داکار واپسی کا ارادہ کیا۔گنی بساؤ سے محفوظ واپسی پر بھی کا جو نے ہماری مدد کی۔ واپسی کا سفر طویل رہا۔چارٹرڈ ایلیٹالیا طیارے کی پرواز میں دیر ہوگئی۔

میں داکار میں ٹینس اور گالف کھیلتا تھا۔ چند فرانسیسی اور اعجاز بخاری بھی میرے ساتھ کھیلتے۔ایک روز میں نے مارکر سے کھیلنے کے لیے دو گھنٹے کے لیے ٹینس کورٹ بک کرا لیا۔فرانسیسی سیاحوں کا ایک گروہ کرسیوں پر بیٹھا ٹینس کورٹ فارغ ہونے کا انتظار کررہا تھا کیوں کہ باقی تمام کورٹس بھی شام تک بک تھے۔وہ جھجکتے ہوئے میرے پاس آئے اور پوچھا کہ مارکر کی بجائے میں ان کے ساتھ کھیلنا پسند کروں گا۔میں راضی ہوگیا۔ یہ پیرس کے مشہور قانون دانوں کا گروہ تھا۔ٹینس کھیلنے کے بعد ہم اچھے دوست بن گئے اورایک دوسرے کی کھانوں سے تواضع کی۔

میری اہلیہ کے بھائی منظر لطیف نے ٹیلی گرام کے ذریعے میرے بیٹے ظافر کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جسے میں نے اپنے نئے فرانسیسی دوستوں کے ساتھ ہوٹل میریڈئین میں منایا۔

سینیگال میں لوگ مختلف مقاصد کے لیے تعویذ لیتے اوراپنی بازو پر باندھتے۔ پڑھائی، ڈرائیونگ غرض یہ کہ ہر شے کے لیے تعویذ دستیاب تھے۔ یہ تعویذ مسلمان پیر دیتے جنہیں سینیگال میں مرید کے نام سے بلایا جاتا۔سینیگال میں سب سے بڑی درگاہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار جیسی تھی۔

سینیگال کے روم میں سفیر سینگھور، جوصدر مملکت کے بھتیجے تھے، نے ''لاطینی زندہ زبان ہے'' کے عنوان پر کانفرنس منعقد کروائی۔ وہ اطالوی وفد کے ساتھ داکار آئے اور قریباً تمام تقاریب میں شرکت کی۔انہوں نے مجھے یونیورسٹی آف پیسا کی ذہین و خوبصورت وسط عمر پروفیسر ڈاکٹر مارینیلا پاسکیوچی (MARINALLA

PASQUNICI) سے گفتگو کرتے دیکھا تو کسی حد تک الجھن اور حسد کا شکار ہو گئے۔ وہ میرے قریب آئے اور اپنی بازو پر شیر کی کھال میں محفوظ تعویذ بندھا دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ جب میں یہ تعویز ہاتھ میں پکڑ لیتا ہوں تو شیر بن جاتا ہوں۔ میں ان کی کم عقلی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

دسواں باب

اقتصادی معجزات کی سرزمین پر واپسی

بون میں بحیثیت وزیر

میں نے جرمن شہر بون کے سفارتخانہ میں وزیر کی حیثیت سے اگست 1977ء تا جون 1981ء تک خدمات انجام دیں۔ یہ بڑا نازک دور تھا کیوں کہ افغانستان اور پاکستان کا نیوکلیائی پروگرام شدید مسائل کا شکار تھا۔ جرمن بظاہر یا خفیہ طور پر افغانستان کو جتنی مدد فراہم کر سکتے تھے، وہ کی۔

پاکستان کو اقتصادی مدد دینے والے ممالک میں جرمنی صف اوّل پر تھا۔ دوطرفہ تجارت کا حجم بھی بڑھتا رہا۔ سیاسی محاذ پر جرمنی نے جنوبی ایشیا کو نیوکلیائی ہتھیاروں سے پاک خطہ کی پاکستانی تجویز کی تائید کی۔ جرمنی میں ہتھیاروں میں کمی لانے والی ڈویژن کے سربراہ وسفیر روٹ (RUTTE) نے مجھے بتایا کہ اگرچہ ان کی سرزمین پر امریکی نیوکلیائی ہتھیار موجود تھے جس کے باعث وہ اصولاً پاکستان کے موقف کی تائید نہیں کر سکتے مگر ان کی حکومت کا ماننا ہے کہ پاکستان کا موقف بالکل درست ہے۔ اس کے بعد جرمنی نے پاکستانی موقف کی بھرپور حمایت بھی کی۔ جرمن سفیر سے میری ملاقات اگست کے مہینے میں بہت گرم اور مرطوب دن ہوئی۔ ان سے گفتگو کے دوران

میں قریباً سوچکا تھا۔ اس صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے انہوں نے مجھے بلیک کافی اور سگار پینے کو دیا جس کے بعد میں تازہ دم ہوگیا۔ ملاقات سے قبل میں نے جرمن ساتھی کے ساتھ دو گھنٹے ٹینس کھیلا تھا جس کے باعث خاصی تھکاوٹ کا شکار تھا۔

میری بون آمد سے قبل پاکستان کے جرمن معاشرے کے چند اہم حصوں سے کمزور تعلقات تھے۔ جرمن پرنٹ میڈیا سے تعلقات تو بحران کا شکار تھے۔ Frankfurter Allegemeine Zeitung کے صف اوّل کے صحافی کلاسنا ٹورپ (KLAUSNA TORP) کو پاکستان مخالف تصور کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سوشلسٹ اخبار FrankFurter Rundschau بھی پاکستان مخالف سمجھا جاتا تھا۔ ایک روز میں اپنے پریس اتاشی منیر اے شیخ کو ساتھ لے کر فرینکفرٹ گیا۔ F.A.Z کے کلاسنا ٹورپ اور آخرالذکر اخبار کے کارل گروب (CARL GROBE) سے دوستانہ ماحول میں ملاقات کی۔ اس کے بعد یہ دونوں اخبارات پاکستان کے حوالے سے مثبت ہوگئے۔

ہم بذریعہ ٹرین فرینکفرٹ پہنچے تھے جب کہ ٹرین کی واپسی میں ابھی ایک گھنٹہ سے زائد وقت باقی تھا۔ میں نے پریس اتاشی کو فرینکفرٹ ریلوے سٹیشن سے ملحقہ پی آئی اے کے دفتر چلنے کو کہا۔ اس نے وہاں جانے سے منع کرتے ہوئے کہا کہ جرمنی میں پی آئی اے کا مینیجر خوش آمدید کہنے والوں میں سے نہیں۔ اس کے مشورہ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں اسے پی آئی اے کے دفتر لے آیا جہاں مینیجر احمد خان ترین ہماری اچانک آمد پر ششدر رہ گئے۔ ہماری چائے پر بہت دوستانہ ماحول میں گفت وشنید ہوئی جس کے بعد آنے والے تمام وقت ہم بہترین دوست رہے۔

ریڈیو DEUTSCHE WELLE (وائس آف جرمنی) کا مرکزی دفتر بون سے 20 کلومیٹر دور کولون میں تھا۔ DEUTSCHE WELLE کی انگلش سروس کے سربراہ ڈاکٹر WEISE تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ پاکستان کے شدید مخالف تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ انڈیا کے حق میں اور پاکستان مخالف ہیں۔ متعدد پاکستانی، DEUTSCHE WELLE کے لیے کام کرتے تھے بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر ویزWEISE سے ملاقات کے لیے انہیں فون کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے اس شرط پر ملیں گے کہ مجھے ان کے ساتھ لنچ کرنا ہوگا۔ اس سے بہتر تو کوئی تجویز ہو نہیں سکتی تھی لہٰذا میں پریس اتاشی اور دیگر افسران کو ساتھ لے کر ان سے ملاقات کے لیے گیا۔ ہم نے کلون کے بیلشن (BELGIN) کلب میں لنچ کیا۔

اس ملاقات نے DEUTSCHE WELLE اور پاکستانی سفارتخانہ کے مابین تعلقات کی نئی راہ ہموار کی۔ ڈاکٹر ویز انتہائی معاون اور رفاقت پسند تھے۔ انہوں نے جرمنی میں پاکستان کا تاثر بہتر بنانے کے لیے ہر قسم کا تعاون کیا۔

جرمنی پہنچتے ہی ایک مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا وہ سفارتخانہ اور بلڈنگ مالکان کے مابین تنازع تھا۔ سفارتخانہ کے ایک وکیل کے علاوہ جرمن دفتر خارجہ کی پروٹوکول ڈویژن سے بھی مدد لے رہا تھا۔ میری پروٹوکول کے ڈپٹی چیف سے بات ہوئی جنہوں نے مشورہ دیا کہ مالکان کو چائے پر بلا کر بات کی جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ان کی معمولی سی درخواست تھی کہ یکم دسمبر 1977ء سے جو کرایہ بڑھا تھا اسے یکم اگست 1977ء سے لاگو کیا جائے۔ ہم نے اعلیٰ حکام سے اجازت کے بعد انہیں بقایا جات ادا کر دیئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے تمام جگہ کی از سر نو تزئین کی، نئے قالین بچھائے اور نیا ہیٹنگ سسٹم بھی لگایا۔

1977ء کے آخر میں مجھے حکمران جماعت سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے ہیمبرگ جانا پڑا۔ وہاں ہوٹل اٹلانٹک میں قیام کے دوران میں نے پارٹی کے تمام اعلیٰ عہدیداران بشمول چانسلر شمدٹ (SCHMIDT) سے ملاقات کی۔ میرے سسر ایم لطیف 1946ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ہیمبرگ اور اسی ہوٹل میں قیام پذیر تھے جب انہوں نے جرمنوں کو سگریٹ اور خوراک کے لیے کوڑے دانوں کی تلاشی لیتے دیکھا۔ اس عرصہ میں جرمنی بہت امیر ہو چکا تھا۔ ہیمبرگ اپنے نائٹ کلبوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ علاقہ ریپر بین (RIQER BAHN) اور سینٹ پولی کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔ میں نے نائٹ کلب میں شو دیکھنے کے لیے

ہوٹل کونسیرج (CONSIRGE) سے ٹکٹ خریدا۔ میں جیسے ہی کلب داخل ہوا، ایک خوبصورت خاتون میرے پاس آئی اور اپنے لیے شراب خریدنے کی درخواست کی۔ اس نے کہا کہ وہ شیمپئن پینا پسند کرے گی جس کی قیمت 100 ڈی ایم سے زائد تھی۔ میں نے کہا کہ میری اتنی مہنگی شراب پلانے کی حیثیت نہیں جس پر اس نے وسکی کا کہا، وہ بھی مہنگی تھی۔ میں کوکا کولا پی رہا تھا اور اسے بھی یہی پینے کی پیشکش کی۔ یہ سنتے ہی لڑکی غائب ہو گئی اور میں نے سکون سے شو دیکھا۔

صدر ضیاالحق نومبر 1979ء میں براستہ فرینکفرٹ امریکہ اور ہوانا، کیوبا پہنچے۔ جرمن سٹیٹ سیکریٹری وین ویل (VAN-WELL) کو ان کی خدمت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ دریائے رائن میں کروز پر سواری کے دوران صدر ضیا نے جرمن حکام کو روس کے افغانستان پر قبضے کے خطرہ سے آگاہ کیا۔ جرمن حکام یہ ماننے کو تیار نہ تھے۔ چند ہفتوں بعد 26 دسمبر 1979ء کو سوویت یونین نے کابل پر قبضہ کرلیا۔ سٹیٹ سیکریٹری نے ہمیں دفتر خارجہ بلایا اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ضیاالحق ٹھیک کہتے تھے۔ سوویت یونین خود کو وسعت دینے کے لیے پیش قدمی کر چکا تھا۔

ضیا نے جرمن حکام سے معاشی ترقی میں مشاورت کی درخواست کی جس کے جواب میں چانسلر شمدٹ نے سابق اقتصادی وزیر مسٹر شلر کو اس مقصد کے لیے تعینات کیا۔ شلر نے ایک رپورٹ لکھی جس کا مقصد پاکستانی معیشت کو آزاد کرنا تھا۔ بدقسمتی سے فنانس منسٹر غلام اسحاق خان نے اس رپورٹ کو سرد خانہ کا شکار کر دیا۔

ضیا کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس اور امریکی صدر سے ملاقات کے لیے امریکہ جانا تھا۔ راستے میں فرانسیسی صدر سے بھی ملاقات متوقع تھی۔ انہوں نے مجھے فیملی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے پیرس بلایا۔ ایران اور عراق کے مابین جنگ چھڑ چکی تھی۔ ضیاالحق دونوں مسلم ممالک میں امن کے لیے مشرقِ وسطیٰ گئے۔ انہیں وہاں چند روز لگ گئے اور مجھے پیرس میں ہی رہنا پڑا جب کہ مجھے ضیاالحق کے امریکہ واپسی پر دورہ کے انتظامات کرنا تھے۔

جرمنی نے انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر افغانستان کو مزاحمت کے لیے بذریعہ پاکستان امداد اور چھوٹے ہتھیار دیئے۔ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جرمنی کے افغانستان کے ساتھ تعلقات خوشگوار تھے اور افغان پولیس کی تربیت و دیگر امور میں جرمنی اس کی مدد بھی کر چکا تھا۔

اکتوبر 1980ء کو صدر ضیا الحق، بون آئے جہاں چانسلر شمدٹ نے ان کا ریڈ کارپٹ استقبال کیا۔ ان دنوں پولینڈ، سوویت کے زیر قبضہ ہونے کے باوجود فسادات کا شکار تھا۔ سوویت نے افغانستان میں مصروفیت کے باعث پولینڈ میں فوج استعمال نہ کی۔ بون میں پریس کانفرنس کے دوران ضیا الحق نے جذباتی خطاب کرتے ہوئے مغربی دنیا سے افغان مزاحمت کے تعاون کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا کہ سوویت نے پولینڈ میں فسادات پر اس لیے قابو نہیں پایا کیوں کہ اس کے ہاتھ افغانستان میں بندھے ہوئے ہیں۔

چانسلر شمدٹ، ضیا سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے صدر پاکستان کو کسی بھی وقت دورۂ جرمنی کی دعوت دیتے ہوئے یقین دہانی کرائی کہ ان کا فقید المثال استقبال کیا جائے گا۔ گفتگو کے دوران شمدٹ نے دوسری جنگ عظیم میں اطالوی فوج کے حوالے سے لطیفہ سنایا۔ لطیفہ کے مطابق اطالوی ٹینکوں میں چار گیئر ہوتے ہیں جن میں سے تین پیچھے اور ایک آگے بڑھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ شمدٹ نے کہا کہ اگر دشمن پیچھے سے حملہ کر دے تو یہ چوتھا گیئر بھی پسپا ہونے میں مدد کرتا تھا۔

ضیا الحق اور ان کا خاص عملہ میرے گھر ٹھہرے۔ ضیا الحق نے ہمارے سفیر افتخار علی کی رہائش گاہ پر عشائیہ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر میری درخواست پر مان گئے۔

تیل کی قیمتیں بڑھیں تو یورپ کی شاہراہوں پر رفتار کی حد مقرر ہوگئی۔ تاہم جرمنی نے حد رفتار مقرر نہ کی۔ چند حلقوں نے جرمنی سے حد رفتار مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جس پر چانسلر شمدٹ نے عوام کے مابین کہا کہ وہ ایسا نہیں کریں گے کیوں کہ اس طرح

جرمن معیشت کی رفتار میں بھی کمی آئے گی اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کے کارمینوفیکچرر امریکہ جیسی بری گاڑیاں بنائیں۔ چانسلر جرمن مرکزی شاہرات پر ٹول ٹیکس کے بھی خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح افراد اور سامان کی رفتار میں کمی آئے گی جو جرمن معیشت کی رفتار کم کرنے کے مترادف ہوگی۔ معیشت کی رفتار کم کرنے سے نقصان ٹول ٹیکس سے کمائے گئے منافع سے کہیں زیادہ ہوگا۔

لنکی ہوفمین بش جرمن ریل گاڑیوں کے صف اوّل کے مینوفیکچرر تھے جنہوں نے پاکستان ریلویز کے ساتھ مشترکہ طور پر 1966ء میں ریل گاڑیاں بنانے کی فیکٹری لگائی تھی۔ انہوں نے ہم سے رابطہ کیا اور جدید ڈیزائن کی ریل گاڑیاں بنانے کی تجویز دی جو نہ صرف پاکستان کے کام آسکتی تھیں بلکہ انہیں بیرون ممالک بھی برآمد کیا جاسکتا تھا۔ بدلے میں وہ چاہتے تھے کہ پاکستان بیس ریل گاڑیاں خریدے جن کی مالیت دو کروڑ روپے بنتی تھی۔ یہ تجویز وزیر ریلوے لیفٹیننٹ جنرل سعید قادر کو بھیجی گئی۔ ہمیں جو جواب موصول ہوا وہ مایوس کن اور غیر سنجیدہ تھا۔ سعید قادر نے ہمیں خط میں لکھا کہ ریلوے انجینئرز نے انہیں بتایا ہے کہ پاکستان کو جدید ریل گاڑیاں بنانے کے لیے بیرونی امداد کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ خود ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وزیر نے مثال بھی دی کہ پاکستان، بنگلہ دیش کو بوگیاں برآمد بھی کر رہا ہے۔ ہم نے لنکی ہوفمین کو بتایا کہ پاکستان ریلویز کے انجینئر خود مختار ہیں، لہٰذا انہیں کسی قسم کی تکنیکی مدد کی ضرورت نہیں۔ آج اس واقعہ کے 35 سال بعد بھی حقیقت یہ ہے کہ اسلام آباد میں کیرج فیکٹری زبوں حالی کا شکار اور نصف صدی قبل بننے والی ریل گاڑیاں بنانے کی صلاحیت سے بھی محروم ہے۔

موجودہ وزیر ریلوے غلام احمد بلور سے ملاقات کے دوران میں نے انہیں مذکورہ بالا واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ ہم آج بھی اس کی کوشش کر سکتے ہیں جس پر انہوں نے چونکا دینے والی خبر بتائی کہ پاکستان ریلوے کے پاس اس کے ملازمین کی تنخواہوں جتنے وسائل بھی نہیں۔ ایسی صورتِ حال میں کیرج فیکٹری کی تعمیر نو کیسے ممکن ہوگی؟

حکومت برطانیہ خاصا بہتر ریلوے نظام چھوڑ گئی تھی جو بتدریج تباہی کا شکار ہو گیا۔

میں افتخار علی اور ان کے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ان کے بڑے بھائی شیخ امیر علی اچھے دوست اور ان دنوں میرے مہمان تھے جب میں بون میں سیکنڈ سیکریٹری تعینات تھا۔ افتخار علی میرے ساتھ سرد مہری سے پیش آتے۔ انہیں یہ بات ہضم نہیں ہوتی تھی کہ میں صدر پاکستان کا فرسٹ کزن ہوں افتخار علی کی مدد کرنے کے باوجود ان کے صدر اور میرے حوالے سے سرد مہری ختم نہ ہو سکی۔ افتخار علی کی غیر تسلی بخش کارکردگی کی رپورٹ مسٹر شاہی کو پہنچی تو انہوں نے بذریعہ خط ناخوشی کا اظہار کیا۔ آغا شاہی کو ان سے خار تھی۔ بھٹو نے افتخار علی کو سیکریٹری خارجہ مقرر کر کے شاہی کو پیکنگ میں سفیر بنایا تھا۔ آغا شاہی کا خیال تھا کہ افتخار علی نے تعلقات استعمال کرتے ہوئے سیکریٹری خارجہ کا عہدہ حاصل کیا اور انہیں ان کے حق سے محروم کیا تھا۔ افتخار علی بطور اچھے افسر پہچانے جاتے تھے، تاہم میں نے محسوس کیا کہ وہ جرمنی میں اپنے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ شاہی افتخار علی کو سروس سے نکالنا چاہتے تھے۔ میں نے صدر مملکت کو شاہی کی تجویز مسترد کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے مان لی۔ جب تک افتخار علی کے ساتھ کام کیا وہ میرے تعاون کے باوجود میرے حوالے سے غیر سنجیدہ رہے۔

چوں کہ افضال قادر، بنگالی تھا لہٰذا وزارتِ خارجہ میں اس کی وفاداری کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا جس کے باعث اسے کونے میں کر دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اسے بیرون ملک بھی تعینات نہ کیا گیا۔ جب ضیاالحق اقتدار میں آئے تو میں نے انہیں بتایا کہ افضال قادر محب وطن پاکستانی ہے اور اسے بہتر ذمہ داری دینی چاہیے۔ اس کے بعد افضال کو پیکنگ میں وزیر اور بحرین، اٹلی اور دیگر ممالک میں سفیر مقرر کیا گیا۔

آغا شاہی کو کسی وجہ سے اکرم ذکی پسند نہ تھے، لہٰذا انہوں نے صدر ضیا کو تجویز دی کہ ذکی کو سازشی ہونے کے ناتے نوکری سے نکال دیا جائے۔ ضیا نے مجھ سے اکرم ذکی کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے کہا کہ وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر سازشی نہیں۔ اس پر ضیاالحق نے شاہی کی تجویز مسترد کر دی۔

1981ء میں ضیاالحق نے سٹراس کو پاکستان آنے کی دعوت تھی۔ سٹراس پاکستان کا اچھا دوست اور پاکستانی مفادات کا حامی تھا۔ وہ کرسچن سوشلسٹ یونین پارٹی جرمنی کا چیئر مین تھا۔ دفتر خارجہ اسلام آباد میں پروٹوکول پروگرام نے اسے خصوصی اہمیت دی اور تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نے اسے اپنے صوبوں میں خوش آمدید کہنا تھا۔

اسلام آباد میں جرمن سفیر ڈاکٹر کلاس ٹرفلوتھ (TERFLOTH)، فری ڈیموکریٹک پارٹی سے وابستہ تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر سٹراس کو اعلیٰ درجہ کا استقبالیہ ملا تو پارٹی ان پر تنقید کرے گی۔

سفیر نے پروٹوکول چیف سے سٹراس کو وزرائے اعلیٰ کی سطح سے کم اہمیت دینے کا کہا۔ پروٹوکول چیف نے سفیر کی بات مانتے ہوئے سٹراس کی آمد پر انہیں صوبائی چیف سیکریٹریوں کے ذریعے صوبائی دارالحکومتوں میں استقبالیہ دینے پر راضی ہوئے۔ میں نے صدر ضیاالحق سے معاملہ اٹھایا جنہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ سٹراس، پاکستان میں صدر کے مہمان کے طور پر آرہے ہیں۔ لہٰذا طے پایا کہ سٹراس کی آمد پر وزرائے اعلیٰ ان کا استقبال جب کہ گورنرز دعوت کا اہتمام کریں گے۔

جرمن سفیر یہ جان کر نالاں ہوئے۔ پشاور میں گورنر لیفٹیننٹ جنرل فضل حق کی دعوت پر جرمن سفیر اس بنیاد پر عشائیہ سے باہر چلے گئے کہ انہیں مرکزی میز پر مناسب جگہ نہیں دی گئی۔ فضل حق نے خفگی کا اظہار کیے بغیر سفیر کو جانے دیا۔ ان سے کسی نے بھی واپس آنے کی درخواست نہ کی۔ سٹراس کو لنڈی کوتل اور طورخم کا دورہ کرایا گیا اور اگلے روز انہوں نے خیبر رائفلز کے ساتھ لنچ کیا۔

سٹراس شکار کے شوقین تھے لہٰذا انہیں بٹیر کے شکار پر لے جایا گیا۔ زیادہ تر بٹیروں کو پہلے سے پکڑ کر ان کے پر کاٹ دیئے گئے تھے تا کہ وہ اڑ نہ سکیں۔ اس طرح ان کے لیے کچھ پرندے شکار کرنا آسان ہو گیا۔ میجر جنرل (بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل) صغیر حسین سید نے اس شکار کا اہتمام کیا۔

میں نے لاہور میں سٹراس اور ان کے وفد کو اپنے سسر سی ایم لطیف کی رہائش

گاہ پر چائے کی دعوت دی۔ اس دعوت میں اس وقت کے صوبائی وزیر خزانہ نواز شریف بھی موجود تھے۔

دورۂ کوئٹہ کے دوران سٹراس نے مقامی ہسپتال کو کچھ سامان بھی عطیہ کیا۔ انہوں نے لورالائی بلوچستان ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ کے قیام کا اعلان بھی کیا۔ بعدازاں یہ ادارہ بنا اور صوبائی حکومت کے اختیار میں دے دیا گیا۔

جرمنی میں سیاسی پارٹیوں کے اپنے ادارے ہوتے ہے جس کی بنیاد پر اندرون ممالک تمام امور اور بیرون ممالک کے ساتھ راہ ورسم بڑھائے جاتے ہیں۔ سٹراس وہ پہلے جرمن لیڈر تھے جنہوں نے HANS SEIDEL FOUNDATION کا دفتر قائم کیا جو پاکستان میں سی ایس یو (CHRISTIAN-SOCIALIST-UNION) کا حصہ تھا۔

جرمن معیشت کا زیادہ دارومدار برآمدات و درآمدات پر ہے جس میں صنعت چار چاند لگا دیتی ہے۔ جرمن سیاسی اور بیوروکریٹک مشینری وہ سب مہیا کرتی ہے جس کی ضرورت ہو۔ جرمن چانسلر کا دفتر اور دیگر وزارتیں معیشت کا بھرپور خیال رکھتی ہیں اور کسی بھی صنعت کو درآمدات یا برآمدات کے حوالے سے کوئی سہولت یا مدد درکار ہو تو فوراً مہیا کی جاتی ہے۔ چانسلر بذاتِ خود یا ان کے دفتر سے اس ملک کے سفیر سے رابطہ کیا جاتا ہے جہاں صنعتکار کو کوئی مسئلہ درپیش ہو اور خدشات کا اظہار کرتے ہوئے رکاوٹیں دُور کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔

جنوری 1981ء کو کیوبا کے قومی دن کی تقریب بون کے ہوٹل کونگیشوف (KONIGSHOFF) میں ہوئی جہاں سوویت سفیر مسٹر سیمینو و (جو کہ POLIT BURO کے ممبر تھے) نے اچانک مجھ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ماسکو میں سوویت کانگرس کے فیصلے یو ایس ایس آر میں تمام معاملات سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ میں ان کی بات نہ سمجھ پایا اور اسے دہرانے کی درخواست کی۔ سیمینو و غصہ میں آ گئے اور اپنے دو افسران کو بلا کر ترجمہ کرنے کا کہا۔

انہوں نے کہا کہ افغانستان میں بزکچی (مسلح دہشت گرد) کی مدد کر کے پاکستان آگ سے کھیل رہا ہے۔ پاکستان نے یو ایس ایس آر کی ناراضگی مول لی ہے۔ پاکستان کو سمجھنا چاہیے کہ سوویت یونین قریب اور امریکہ دُور ہے۔ میں نے سیمینووسے کہا کہ ہم سوویت یونین سے دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی علم ہے کہ سوویت قریب اور امریکہ دور ہے۔ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ مجاہدین اپنے ملک کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور جانیں دے رہے ہیں۔ تاریخی طور پر افغانوں نے حملہ آوروں کو کبھی اپنے ملک پر قابو پانے نہیں دیا۔ درحقیقت روسی بزکچی (مسلح دہشت گرد) ہیں۔ افغانستان میں امن اسی وقت آئے گا جب سوویت حملہ آور ملک چھوڑیں گے۔ سیمینووکو علم تھا کہ میں صدر ضیا الحق کا فرسٹ کزن ہوں۔ انہوں نے سوویت کی جانب سے پاکستان کو دھمکی دینے کی کوشش کی تھی۔ تاہم میرے جواب سے مایوس ہو کر وہ چلے گئے۔

1970 کے اختتام میں ریڈ بریگیڈ دہشت گرد یا خود ساختہ بادر منحوف (BAADAR MINEHOFF) گینگ جو زیادہ تر یونیورسٹی طلبا پر مشتمل تھا، نے جرمن معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ آندریا بادر اور الرائیک منحوف (ULRIKE MINEHOFF) اس تنظیم کے اہم سربراہان تھے۔ تین اہم شخصیات، آئینی کورٹ کے صدر، جرمن فیڈریشن آف انڈسٹریز کے صدر اور ڈریسڈنر (DRESDNEN) بینک کے صدر کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ جرمن فیڈریشن آف انڈسٹریز کے صدر کو اغوا کے بعد چند روز تک تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ دہشت گرد تعلیم یافتہ، ذہین اور پھرتیلے تھے۔ جب بھی ان کا اور فربہ جرمن پولیس والوں کا آمنا سامنا ہوتا تو پولیس کو ناکامی اور بعض اوقات ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ نوجوان جرمنوں کو لازمی فوجی ٹریننگ کے بعد دہشت گردی کے حوالے سے تربیت دی گئی جس کے بعد وہ دہشت گردوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ ہماری درخواست پر چند پاکستانی پولیس افسران کو بھی بون میں دہشت گردی سے نبرد آزما ہونے کی تکنیکی تربیت ملی۔

پاکستان میں خوراک کی مسلسل کمی کے باعث ہمیں حکام نے ہدایت کی کہ جرمن حکومت سے اڑھائی ہزار ٹن گندم عطیہ لی جائے۔ اتنی قلیل مقدار کے لیے درخواست کرنا باعث شرمندگی تھا، تاہم ہم نے احکامات مانے اور گندم گوکلو کی شپنگ لائن کے ذریعے پاکستان پہنچی۔ گوکلو کابینہ میں وزیر اور بحری جہازوں کے اہم ادارہ کے مالک تھے۔

70ء کی دہائی کے اختتام پر معاہدۂ وارسا اور نیٹو کے مابین بہت زیادہ کشیدگی تھی۔ امریکہ نے اپنا نیوکلیائی کروز میزائل جرمن سرزمین پر نصب کر دیا تھا جو سوویت یونین میں مختلف اہداف کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ سوویت نیوکلیائی ہتھیار ایسے مقامات پر نصب کیے گئے جو جرمنی میں امریکی اڈوں کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ جرمن افواج بھی یورپ میں سب سے بڑی اور جنگی ساز و سامان سے لیس تھیں۔ جرمنی کو خطرہ تھا کہ اگر لڑائی شروع ہوئی تو بہت زیادہ تباہی ہوگی۔ میرا ایک قریبی جرمن دوست ڈراوڈی ایٹمی بنکر بنا رہا تھا جس کا مقصد نیوکلیائی جنگ کے دوران لوگوں کا تحفظ تھا۔ وہ ایسے برقی آلات بھی بنا چکا تھا جو فلپس جیسی بڑی الیکٹرانک کمپنیوں نے خرید رکھے تھے۔ اس نے ایک بار مجھے اپنے گھر بلایا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دروازہ پر اس کا نام پولیس انسپکٹر ڈراوڈی درج تھا۔ میں نے گھنٹی بجاتے وقت سوچا کہ شاید میں غلط جگہ پر آ گیا ہوں لیکن ڈراوڈی نے ہی دروازہ کھولا۔ میں نے اس سے اپنے نام کے ساتھ پولیس انسپکٹر لکھنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے مجھے اپنا گھر دکھایا جہاں مہنگی پینٹنگز اور قیمتی سجاوٹی اشیا رکھی تھیں۔ ڈراوڈی نے کہا کہ اس نے چوروں سے بچنے کے لیے گھر کے باہر کتبے پر پولیس انسپکٹر لکھوایا تھا۔ نیوکلیائی جنگ میں جرمنی کی تباہی کے خدشہ کے پیش نظر ڈراوڈی، آسٹریلیا ہجرت کر گیا۔

آخن ٹیکنیکل یونیورسٹی میں آثارِ قدیمہ کا انتہائی اعلیٰ شعبہ موجود تھا۔ میں نے وہاں موہنجو داڑو کے مقام پر دریائے سندھ کی تہذیب کا مطالعہ کروایا۔ ڈاکٹر مائیکل جینسن کی سربراہی میں ان کی ٹیم نے اس پر عمدہ کام کیا تھا۔

میری بون آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد فرینکفرٹ میں مقیم چند پاکستانیوں نے سفیر

کو فنکشن پر دعوت دی۔ مجھے بتایا گیا کہ ایسے فنکشن میں ہجوم عام طور پر جارح ہو کر جھگڑنا بھی شروع کر دیتا ہے اور بعض اوقات سفارتخانے کے عملہ کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سفیر افتخار علی، پریس اتاشی اور دیگر افسران نے فرینکفرٹ جانے سے معذرت کر لی۔ اور اس مقصد کے لیے مجھے قربانی کا بکرا بنایا گیا۔

میں تقریب میں شرکت کے لیے فرینکفرٹ گیا جہاں لوگ واقعی غیر تہذیب یافتہ اور بدمزاج تھے۔ مجھے خطاب کی دعوت دی گئی تو میں نے کہا کہ بھٹو نے لاہور میں جو دعویٰ کیا تھا کہ پیسے درختوں سے گریں گے، غلط تھا۔ وہ اپنے خاندان سے کوسوں دُور جرمنی میں پیسہ کمانے آئے۔ میں نے انہیں سردی سے ٹھٹھرتے اور اس سے بچاؤ کے لیے ڈپارٹمنٹل سٹورز میں اِدھر اُدھر جاتے دیکھا ہے۔ انہیں جرمن قوم کی کامیابی اور اس کے پیچھے ان کے آباؤ اجداد کی سخت محنت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ محنت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ایک گروہ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے تاریخ کے اوراق سے سبق دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اس گروہ نے چیخنا شروع کر دیا۔ اسی دوران دوسرا گروہ کھڑا ہوا اور میرے موقف کی تائید کی۔ دونوں گروہوں میں لڑائی شروع ہوئی اور جو گروہ مجھ پر چلایا تھا، اسے ہال سے نکال دیا گیا۔ وہاں موجود افراد کی اکثریت بشمول پی آئی اے کے جرمنی میں مینیجر احمد خان ترین میری گفتگو سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد ہم بہت اچھے دوست بن گئے۔

گیارہواں باب

روم میں بحیثیت سفیر تعیناتی

بون میں بحیثیت وزیر خدمات کے آخری دور میں جمشید مارکر، جرمنی میں پاکستان کے سفیر تعینات ہوئے۔ میرے بون رہنے تک ہم بہت اچھے دوست اور اکثر معاملات میں ہم خیال رہے۔ چوں کہ میری بطور سفیر تعیناتی متوقع تھی تو مارکر نے مجھے اٹلی تعینات ہونے کا مشورہ دیا جہاں ہم دونوں کے خیال میں پاکستان کے سیاسی، معاشی اور کمرشل تعلقات کو بڑھانے کے کافی امکانات تھے۔

ایک شام صدر ضیاالحق نے فون کر کے پوچھا کہ میں بطور سفیر کہاں تعینات ہونا چاہوں گا۔ مارکر کی نصیحت مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اٹلی کا انتخاب کیا۔ ضیا نے کہا کہ اٹلی میں تعیناتی تو تفریح کے مترادف ہے۔ میں نے کہا کہ سر ایسی بات نہیں کیوں کہ اٹلی صف اوّل کے صنعتی ممالک میں شمار ہوتا ہے جہاں دونوں ممالک کے معاشی تعلقات میں اضافہ کا بہت امکان ہے۔ ضیاالحق نے کہا کہ ان کی رائے اس بنیاد پر تھی کہ اٹلی میں جتنے بھی سفراء مقرر ہوئے ان میں سے اکثر ریٹائر سول یا ملٹری افسران تھے۔ تاہم انہوں نے میری درخواست مان لی جس کے نتیجے میں مجھے روم میں کم عمر ترین پاکستانی سفیر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ جب چار سال بعد میرا اٹلی سے جرمنی تبادلہ ہوا تو ضیا نے مجھ سے پوچھا کہ میری جگہ اٹلی میں کس کو ہونا چاہیے۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا کہ چوں کہ اٹلی میں

تعیناتی تفریح کے مترادف ہے لہٰذا وہ کسی بھی ریٹائرڈ افسر کو تعینات کر سکتے ہیں۔ ضیاالحق نے جواب دیا کہ میری تعیناتی سے قبل انہیں اٹلی کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔

اٹلی روانگی سے قبل میں نے صدر ضیاالحق سے رسمی ملاقات کی۔ اس دوران گفت وشنید میں صدر نے بتایا کہ اٹلی میں ان کے تین دوست ہیں جن سے مجھے رابطہ کرنا چاہیے۔ یہ اٹلی کے آرمی چیف جنرل کاپوزو، اٹلی میں اسلحہ بنانے والی فیکٹری اوٹو میلارا کے صدر انجینئر سٹیفنی اور اسی کمپنی کے چیف انجینئر فیراری تھے۔ ان افراد کو برطانیہ نے مصر میں قید کیا اور بعد میں انڈیا کی جیل میں منتقل کر دیا تھا۔ ضیا کو بطور جونیئر افسران اطالوی قیدیوں کی حفاظت کا ذمہ دیا گیا۔ چوں کہ اٹلی اور انڈیا میں کوئی دشمنی نہ تھی، لہٰذا ضیاالحق ان سے اچھے طریقے سے پیش آئے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھا۔ یہ بین الاقوامی برادری کے جنگی قیدیوں سے سلوک کے بارے میں جنیوا کنونشن پر 1949ء میں معاہدہ سے پہلے کی بات تھی۔

اٹلی آمد پر میری سطح کے عہدیداران کے لیے ایسی تقریبات کا اہتمام شاذ و نادر ہی ہوتا۔ اطالوی پروٹوکول چیف مجھے صدارتی محل لے گئے جہاں عظیم الشان تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ صدر پرٹینی سے ملاقات بہت خوشگوار رہی۔ مسولینی اور جرمنی کے خلاف مہم میں اہم کردار ادا کرنے کے باعث اٹلی میں انہیں بہت عزت حاصل تھی۔ اس سے پیشتر کہ میں رسمی تقریر کا آغاز کرتا پرٹینی نے میری تقریر مانگی اور کہا وہ فنکشن کے بعد پڑھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ رسمی تقاریر پر وقت ضائع کرنے کی بجائے میں انہیں پاکستان اور افغانستان میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کے بارے میں بتاؤں۔ اٹلی نے افغانستان میں آزادی کی لڑائی کا ساتھ دیتے ہوئے افغانوں کی ہر ممکن مدد کی تھی۔

روم میں سفیر کی رہائش گاہ اٹلی کی مشہور تباہ شدہ عمارت Terme de CARACALLA کے قریب تھی۔ رہائش گاہ کے قریب تباہ کاری کے متعدد مناظر دیکھ کر پہلی نظر میں روم کبھی اچھا نہیں لگتا۔ اس کی خوبصورتی وقت کے ساتھ ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ پھر روم چھوڑنے کا خیال بھی اداس کر دیتا ہے۔

روم آمد کے بعد پہلی عید آئی تو میں نے ہمارے وِلا میں دعوت کا اہتمام کیا۔ میں نے ون ڈش کی تجویز منظور نہ کی۔ افسران، سٹاف ممبران اور پاکستانی کمیونٹی یہ دیکھ کر حیران تھے کہ سفیر، اس کی اہلیہ اور بچے لوگوں کو مشروبات اور کھانا خود پیش کر رہے ہیں۔

میری اہلیہ نے مرد حضرات کے لیے سر کے بل کھڑا ہونے کا مقابلہ کرایا۔ اس شخص کے لیے انعام رکھا گیا جو سب سے زیادہ دیر تک اس حالت میں کھڑا ہوا۔ آئی ایف اے ڈی (IFAD) انٹرنیشنل فنڈ فار ایگریکلچرل ڈویلپمنٹ کے اسسٹنٹ نائب صدر سرتاج عزیز نے یہ انعام جیتا۔

انتہائی شاندار دکانیں جہاں عمدہ ترین اشیا فروخت کی جاتیں، وہ بھی باہر سے خستہ حال ہوتیں۔ گھروں اور ولاز کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے برعکس عمارت میں داخل ہو کر آپ اطالوی فن تعمیر کے مداح ہو جاتے۔ روم تعیناتی سے قبل میرا خیال تھا کہ پاکستانی، چینی اور فرانسیسی کھانے دنیا بھر میں بہترین ہیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اطالوی کھانے دنیا میں سرفہرست مانے جاتے ہیں۔ دیگر کھانوں کے برعکس یہ فطرت کے قریب اور بنانے میں آسان ہیں۔ اس کی بہترین مثالیں پیزا اور سپیگیٹی ہیں۔ بیشتر اطالوی پرسکون اور دوستانہ فطرت کے مالک ہیں۔ انہیں بہتر زندگی گزارنے اور اپنے حال میں خوش رہنا آتا ہے۔ یہ لطیفہ بھی عام ہے کہ خدا نے اٹلی بنانے کے بعد دیکھا کہ یہ تو بے مثال بن گیا تو اس نے اس کی قدر و منزلت میں تھوڑی کمی لانے کے لیے یہاں اطالوی باشندے بھیج دیئے۔

ان دنوں اٹلی میں مافیا کی بھرمار تھی اور آپ کسی شخص سے بات کرتے ہوئے یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ عام شہری یا مافیا کارکن ہے۔ 70ء کی دہائی کے آخر میں اطالوی دہشت گرد گروہ ریڈ بریگیڈ نے وہاں زندگی حرام کر رکھی تھی۔ سابق اطالوی وزیراعظم ایلڈو مورو کو ریڈ بریگیڈ نے اغوا اور بعد ازاں قتل کر دیا۔ میں نے ایک اطالوی صنعت کار سے پوچھا کہ ریاست نے ریڈ بریگیڈ کو ختم کر دیا مگر مافیا کو جڑ سے اکھاڑنے میں ناکام کیوں ہے۔ اس کا جواب تھا کہ دہشت گردوں کو اس لیے ختم کر دیا گیا کہ وہ

ریاست کے خلاف تھے جب کہ مافیا ریاست کا ہی حصہ ہیں۔ یہ ان کی سوچ کا ایک حصہ تھا۔ میں متعدد اہم شخصیات سے ملا جو دراصل مافیا کے اہم ترین اراکین تھے۔

سسلی تمام مافیا کا گڑھ ہے۔ دراصل اس کی ابتدا بیرونی حملہ آوروں کو نکالنے کی کوشش سے شروع ہوئی۔ سسلی میں صنعتی نمائش ہوئی جس میں پاکستان بھی شرکت کر رہا تھا۔ وہاں بظاہر تو ریاست کی طرف سے سکیورٹی ملی ہوئی تھی مگر اصل محافظین مافیا کے لوگ ہی تھے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں مافیا سے وابستہ افراد شامل تھے۔

جہاں تک معاشرتی ثقافت کا تعلق ہے تو غالباً اٹلی متمول ترین ملک ہے۔ نہ صرف روم بلکہ فلورنس، وینس، میلان اور تقریباً ہر شہر ہی دیکھنے کے لائق ہے۔ اطالوی دستکاری بھی لاجواب ہے۔ اس کی چند عمدہ ترین مثالیں COSTA AMALFITANI اور BRESCIA ہیں۔

جب میں روم تعینات ہوا تو ظافر کم عمر تھا۔ ہمارا اطالوی ڈرائیور کیروٹی، ظافر کو بہت پسند کرتا اور اس کے ساتھ فٹ بال کھیلتا تھا۔ اس نے ظافر کو پاستا اور ٹماٹر کا سوس بنانا بھی سکھایا جس کی ترکیب اسے آج بھی یاد ہے۔ اطالوی بچوں سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اطالوی گھرانوں میں بچے بادشاہ ہوتے ہیں۔ وینس میں سفر کے لیے کشتی استعمال کی جاتی ہے۔ وہاں پہنچنے پر ہم نے ایک کشتی کرائے پر لی، اس پر سامان لادا اور GRITTI HOTEL کی طرف روانہ ہوئے۔ ظافر نے سوٹ کیس کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ ہمیں خدشہ تھا کہ سوٹ کیس پانی میں نہ گر جائیں۔ ہم نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آیا۔ میں نے ملاح کو اسے منع کرنے کا کہا۔ ملاح نے جواب دیا کہ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں، کیا ہوا اگر سوٹ کیس پانی میں بھی گر جائے۔

پومپیائی (POMPEII) اٹلی کا مشہور شہر ہے جو آتش فشاں ماؤنٹ ویسووس (VESUVIUS) کی نذر ہو گیا۔ وہاں پہنچنے پر ہم نے آتش فشاں سے بھاپ نکلتے دیکھی جس پر لوگ انڈے ابال رہے تھے۔ آتش فشاں نے پہلے راکھ اور پھر لاوا اُگلا۔ اگرچہ راکھ جان لیوا ہوتی ہے تاہم یہ شہ پاروں کو محفوظ رکھنے کے کام بھی آتی

ہے۔ نیپلز کے عجائب گھر میں ہم نے پومپیائی سے لائی گئی تصویر دیکھی جس میں سکندر اعظم، فارس کے بادشاہ دارا کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ تصویر ہزاروں چھوٹے ٹکڑوں سے بنی ہوئی تھی۔ یہ اس قدر حقیقی لگ رہی تھی کہ کوئی بھی اسے بنانے والے کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دیگر اشیا کے علاوہ، اٹلی بھینس کے دودھ سے تیار کردہ موزاریلا پنیر کے لیے بھی مشہور ہے۔ میرے سننے میں آیا کہ چند صدیاں قبل یہ بھینسیں انڈیا سے درآمد کی گئی تھیں۔

1981ء میں روم میں سیاحت پر بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ رکن ممالک کے وزرائے سیاحت نے بھی شرکت کی۔ ایک شام استقبالیہ کے دوران سوویت وفد کے سربراہ میرے پاس آئے اور کہا کہ پاکستان افغان جنگجوؤں کی مدد کر کے سوویت مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ پاکستان کو چاہیے کہ اپنے تحفظ کے لیے اس سے باز رہے۔ میں نے جواب دیا کہ پاکستان ہی نہیں پوری دنیا افغانستان میں آزادی کی لڑائی لڑنے والوں اور سوویت یونین کے انخلا کی حامی ہے۔ سوویت سربراہ نے کہا کہ یہ مغربی پراپیگنڈا ہے اور ہماری افواج افغان حکومت کی دعوت پر وہاں گئی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کے مطابق سوویت ببرک کارمل کے کہنے پر وہاں گئے اور پھر جیسے ہی وہاں پہنچے تو اسے قتل کر دیا۔ دوسرا یہ کہ اقوامِ متحدہ نے سوویت یونین کی افغانستان میں جارحیت کی مذمت کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ محض پراپیگنڈا نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ سوویت وفد کے سربراہ کو میری بات ہضم نہ ہوئی اور وہ چلتے بنے۔

متمول افراد اکثر اغوا اور تاوان کی ادائیگی کے بعد بازیاب ہو جاتے۔ روم اور شمالی اٹلی سے اغوا کیے جانے والے افراد کو جنوبی اٹلی یا سسلی منتقل کر دیا جاتا۔ تب انہیں مختلف افراد کو فروخت کر دیا جاتا اور وکلا کے ذریعے رہا کرایا جاتا۔ اگر اغوا شدہ شخص کو پہلے ہاتھ فروخت کیا جاتا تو اس کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہوتی جب کہ تاوان کی رقم کروڑوں تک جاتی تھی۔

روم اسلامک سینٹر

روم میں مسلم برادری خصوصاً مسلم ممالک کے سفراء کی کوشش تھی کہ اطالوی حکومت روم میں اسلامک سینٹر کے قیام کی اجازت دے۔ کئی سال کوششوں کے باوجود یہ ممکن نہ ہوسکا۔ روم آمد پر مجھے سعودی سفیر اور قریبی دوست خالد الترکی کی مدد سے اسلامک سینٹر کا صدر چن لیا گیا۔ نہ صرف عیسائی بلکہ یہودی بھی اسلامک سینٹر کے مخالف تھے۔ سینٹر کے قیام کی مخالفت میں بے بنیاد دلائل دیئے جاتے مثلاً سعودی عرب نے مکہ میں چرچ کی اجازت نہیں دی تو روم میں اسلامک سینٹر بھی نہیں بننا چاہیے وغیرہ۔ اطالوی حکام سے مذاکرات کے دوران میں نے دلیل دی کہ پاکستان سمیت کسی بھی اسلامی ملک میں چرچ کے قیام پر پابندی نہیں۔ مزید براں مسلمان ویٹی کن کے احاطہ میں مسجد یا اسلامک سینٹر کا مطالبہ نہیں کر رہے۔ اس کی بجائے ہم روم میں سینٹر کا قیام چاہتے ہیں۔ کاوشیں رنگ لائیں اور اطالوی حکام نے روم میں ہماری دس سال پہلے خریدی ہوئی جگہ پر اسلامک سینٹر کے قیام کی اجازت دے دی۔ سینٹر کی تعمیر میں سعودی حکومت نے پیسے دیئے۔ حکومت پاکستان نے سینٹر کے لیے قالین دینے کا وعدہ کیا لیکن پورا نہ کیا۔ روم میں اسلامک سینٹر نہ صرف نماز بلکہ وہاں مقیم مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ روم میں اسلامک سینٹر ہماری سفارتکاری کا شاہکار ہے۔ اطالوی صدر سینڈرو پرتینی نے اسلامک سینٹر کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے مرکز پر موجود تختی پر خدمات کے اعتراف میں میرا نام بھی درج ہے۔

پاکستانی وزیراعظم کو سرکاری خرچ پر ذاتی رہائش گاہ کی تزئین و آرائش کا قانونی حق حاصل ہے۔ بھٹو نے بطور وزیراعظم اٹلی سے چار یا پانچ مورانو گلاس کے بنے فانوس منگوائے تھے۔ مورانو، وینس کے قریب ایک جزیرہ اور رنگین شیشوں سے بنی مصنوعات کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ یہ فانوس بھٹو کے وزارت عظمٰی سے ہٹائے جانے کے بعد سفارتخانے پہنچے۔ دفتر خارجہ سے ہدایات موصول ہوئیں کہ یہ فانوس بھٹو کی اہلیہ یا ان کے کہنے پر کسی شخص کو نہ دیئے جائیں۔ 1981ء کے اختتام پر مجھے علم ہوا کہ

نصرت بھٹو سفارتخانے میں سفیر سے ملنے آئی ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا اور اپنے دفتر لے آیا جہاں چائے پیش کی۔ میں نے دفتر خارجہ کے احکامات کی روشنی میں انہیں فانوس دینے سے معذرت کی۔ بعدازاں صدر ضیا الحق کو بتایا اور ان کی ہدایت کے مطابق فانوس کو دفتر خارجہ کے سٹور میں بھجوا دیا۔

بینظیر بھٹو وزیراعظم بنی تو انہوں نے فانوس کے بارے میں استفسار کیا۔ افضال قادر جو میرے بعد اٹلی کے سفیر اور بعدازاں دفتر خارجہ واپسی پر ایڈیشنل سیکریٹری تعینات ہوئے، انہوں نے فون پر مجھ سے فانوس کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے انہیں کہا کہ اپنے بستر کے نیچے دیکھیں جس سے مراد دفتر خارجہ کا سٹور تھا۔ فانوس مل گئے اور بینظیر بھٹو کو پہنچا دیئے گئے۔

اٹلی کے قدیم ترین گالف کورسز میں سے ایک اکواء سانتا (AQUA SANTA) میں مَیں گالف کھیلا کرتا تھا۔ میں شاذ و نادر ہی دیگر گالف پارٹنرز کے ساتھ منصوبہ بنا کر گالف کورس گیا ہوں گا۔ جیسے ہی میں خود سے پہلی 'ٹی' تک پہنچتا تو مختلف اطالوی میرے ساتھ شرکت اور مجھے ساتھ لے جانے پر تیار ہوتے۔

ایک روز میں نے ایک اطالوی نوجوان کو پہلی ٹی پر دیکھا اور اس کے ساتھ کھیلنے کی درخواست کی۔ اس نے اپنا تعارف اٹلی کے قومی گالف چیمپئن انجینئر GULLERELLI کے طور پر کروایا۔ اس کے بعد کافی مواقع پر ہم اکٹھے کھیلے۔ میں نے دو پاکستان گالف ٹورنامنٹ منعقد کرائے جس کے لیے پی آئی اے اور روم میں پاکستانی برادری نے ہر ممکن مدد کی۔

میری اہلیہ نے روم کے اوپرا ہاؤس میں بیشتر پاکستان شوز کا اہتمام کیا جنہیں خوب سراہا گیا۔ چوں کہ صدر ضیا الحق مذہبی رجحان رکھتے تھے، لہٰذا میں نے اس قسم کے ثقافتی شوز کے حوالے سے ان کی رائے جاننا چاہی۔ ان کا جواب تھا، 'Do in Rome as the Romans do' (جیسا دیس، ویسا بھیس)۔

1981ء تک قریباً تیس لاکھ افغان مہاجرین نے پاکستان میں پناہ لی۔ یہ

پاکستان کے ناکافی وسائل پر مزید بوجھ تھا۔ کراچی سے پشاور آٹا اور دیگر امدادی سامان پہنچانے کے لیے ذرائع نقل وحمل ناکافی تھے۔ حکومت پاکستان نے ہمیں اٹلی سے پچاس بڑے ٹرک بطور امداد لینے کا ہدف دیا۔ میں نے سیکریٹری جنرل اٹیلین فارن آفس ایمبیسیڈر MALFATTI سے ملاقات میں حکومتی درخواست ان تک پہنچائی۔ انہوں نے مثبت جواب دیتے ہوئے کہا کہ پچاس کی بجائے سو کیوں نہیں۔ نہ صرف ہماری درخواست پر عمل ہوا بلکہ امداد بھی دگنی ملی۔ MALFATTI اپنی کرسی سے اٹھے، کمرے میں الماری کھولی اور ایک رائفل اور خنجر لے کر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ دونوں ہتھیار افغان مجاہدین نے سوویت فوجیوں سے چھینے تھے۔ اٹلی نے ہر شعبہ میں پاکستان سے بھرپور تعاون کیا۔ اطالوی نیوز میڈیا، پاکستان اور افغان تحریک آزادی کا حامی تھا۔

بادشاہ ظاہر شاہ اپنے خاندان اور جنرل عبدالولی خان کے ساتھ روم میں مقیم تھا۔ میری ان سے، خصوصاً جنرل عبدالولی خان سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ صدر ضیاالحق کی بھی جنرل ولی خان سے 1982ء میں میری رہائش گاہ پر ملاقات ہوئی جس میں اتفاق کیا گیا کہ میں دونوں شخصیات کو پیغام رسانی کا ذمہ دار ہوں گا۔ جنرل ولی خان نے متعدد بار پاکستانی ویزہ کی درخواست کی جہاں سے وہ افغانستان بھی جا سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ضیاالحق میرے موقف سے اتفاق کرتے تھے کہ جنرل عبدالولی خان کو پاکستانی ویزہ دینا چاہیے جہاں سے وہ افغانستان جا سکیں۔ تاہم ولی خان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ضیاالحق نے جنرل ولی خان کو قمر السلام کا خفیہ نام دیا۔ میری ہمدردیاں افغان جہاد اور شاہی خاندان کے ساتھ تھیں لیکن میرے خیال میں دباؤ اور جلاوطنی کے باعث یہ خاندان تنہائی کا شکار ہو چکا تھا۔ انہوں نے سوویت کے خلاف اور افغان تحریک آزادی کے لیے عوامی رائے بنانے میں بھرپور کردار ادا نہ کیا۔ حالاں کہ اس مقصد کے لیے اٹلی بہترین ملک تھا۔ اطالوی حکومت، دیگر سیاسی پارٹیاں اور میڈیا افغان تحریک آزادی کے حامی تھے۔

روم میں سفارتی رہائش گاہ پر چغتائی کی دو نایاب پینٹنگز اور مہنگے قالین بچھے

ہوئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ مجھ سے قبل روم میں سفیر اپنے تبادلہ پر ذاتی ساز وسامان کے ساتھ مذکورہ بالا اشیا بھی لے جا رہے تھے۔ سرکاری پراپرٹی کی دیکھ بھال کے ذمہ دار اکاؤنٹنٹ کو اس کا علم ہو گیا جس نے سفیر کو ایسا کرنے سے روکا۔ 1982ء کے اوائل میں ضیاالحق کے دورۂ روم کے دوران میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ یہ پینٹنگز پاکستان بھجوا کر عجائب گھر میں رکھوانی چاہئیں۔ ضیا نے کہا کہ پینٹنگز وہیں رہنے دو، جہاں ہیں۔

جنوری/فروری 1982ء میں ضیاالحق نے دفتر خارجہ اسلام آباد میں چالیس پاکستانی سفراء کی میٹنگ بلائی جس کا مقصد افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت کے حوالے سے ان کی رائے طلب کرنا تھا۔ میٹنگ ایک ہفتہ جاری رہی اور ضیاالحق نے ایک کے سوا تمام اجلاس میں شرکت کی۔ وہ صرف ایک دن صبح کی میٹنگ میں نہ آسکے کیوں کہ انہیں کابینہ اجلاس کی صدارت کرنا تھی جس میں پاکستانی کرنسی کو ڈالر سے غیر وابستہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ سفراء کی میٹنگ میں دو موقف سامنے آئے۔ وزیر خارجہ آغا شاہی کی سربراہی میں ایک موقف کے مطابق پاکستان کو سوویت یونین کی جارحیت پر آنکھیں بند رکھنے کی تجویز دی گئی۔ ماسکو میں سفیر افتخار علی، عبدالستار اور چند دیگر سفراء اس موقف کی تائید کر رہے تھے۔ دوسرے موقف میں افغان تحریک آزادی کی حمایت کا مشورہ دیا گیا۔ آغا شاہی دفتر خارجہ میں قریباً تین دہائیوں سے موثر کردار ادا کرنے کے باعث من پسند افراد کا حلقہ بنا چکے تھے۔ ذاتی رائے رکھنے والے دفتر خارجہ کے افسران نے خود کو اس حلقہ سے دُور رکھا۔ آغا شاہی کے حلقہ کے اراکین کو مراعات ملتی رہتی تھیں۔ چوں کہ میں معتدل رائے رکھتا تھا لہٰذا کبھی کسی گروہ کا حصہ نہ رہا۔ جب افغانستان کے مسئلہ پر میرے بولنے کی باری آئی تو آغا شاہی نے غیر شائستہ انداز میں بتایا کہ میرے پاس اظہارِ خیال کے لیے پانچ منٹ تھے۔ مجھ سے قبل متعدد سفراء کافی دیر تک اظہار خیال کر چکے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ چار منٹ کافی ہوں گے۔ میں نے روس کے ریاستی پھیلاؤ اور گرم پانی کے خطوں تک رسائی کے حوالے سے میٹنگ کا حوالہ دیا۔ 60ء کی دہائی کے آخر میں

روسی صدر برزنیف نے مشترکہ ایشیائی سیکورٹی معاہدہ کی تجویز دی تھی جس میں پاکستان اور بھارت سمیت دیگر جنوبی ایشیائی ممالک بھی شامل تھے۔ اس کا بنیادی مقصد چین کے گرد دائرہ بناتے ہوئے پاکستان اور افغانستان کے ذریعے بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی تھا۔ اس وقت افغانستان اور سوویت یونین میں دوستانہ مراسم تھے۔ سوویت یونین کا مقصد افغانستان کے پہاڑوں پر قبضہ نہیں بلکہ اس کی سرزمین کو استعمال کرتے ہوئے عظیم تر بلوچستان یا بلاواسطہ بذریعہ پاکستان گرم پانی تک رسائی تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ پاکستان بھی روس کی لپیٹ میں آئے گا۔ اگر یہ ممکن ہوگیا تو اللہ کے نام پر بنایا گیا پاکستان سیکولر ریاست میں بدل جائے گا۔ قوم کے بانیوں کی تمام کوششیں رائیگاں چلی جاتیں۔ سوویت کے زیر تسلط دیگر ریاستوں کی طرح پاکستان میں بھی اسلام کی تبلیغ اور اس پر عمل کرنا ممکن نہ رہتا۔ میں نے اس نقطہ پر زور دیا کہ سوویت یونین مختلف ریاستوں کا مجموعہ ہے۔ یہ نوآبادیاتی نظام کا شکار ان افراد پر مشتمل ہے جو آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کی معیشت کمزور اور افغانستان میں مہم جوئی برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ سوویت کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ افغانستان میں رکاوٹیں عبور کر سکے۔ میں نے پیش گوئی کی کہ افغانستان ، سوویت یونین کا قبرستان (ACHILLES HEEL) ثابت ہوگا۔ پاکستان کو اپنے تحفظ اور سالمیت کے لیے افغان مجاہدین کا ساتھ دینا ہوگا۔ آغا شاہی نے میری رائے کو رَد کیا، تاہم صدر ضیاالحق نے میرے موقف کی تائید کی۔ میری رائے نے آغا شاہی کے مقابلے میں متعدد سفراء کی حمایت حاصل کی۔ اس کے بعد صدر ضیا نے سفیر لیفٹیننٹ جنرل (ر) یعقوب علی خان کی سربراہی میں گروہ تشکیل دیا جس کا مقصد سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں تحریک کی حمایت کے لیے مختلف تجاویز اور امریکہ کی جانب سے امداد کی پیشکش پر غور تھا۔ میں بھی اس کا رکن تھا۔ اس سے قبل امریکی صدر کارٹر کی جانب سے پاکستان کو 400 ملین ڈالر امداد کی پیشکش کو صدر ضیاالحق نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ یہ نہ ہونے کے برابر (Peanuts) ہے۔ اس دُور میں ''مونگ پھلی'' ایک لطیفہ بن گیا تھا کیوں کہ صدر

کارٹر مونگ پھلی کے کاشت کار تھے۔ ریگن کے صدر بنتے ہی امریکہ کی افغان پالیسی میں تبدیلی آئی۔ امریکی انتظامیہ نے پاکستان اور افغانستان کی کاوشوں پر خصوصی تعاون کیا۔ بلاشبہ اس طرح امریکہ کے ہاتھ سوویت یونین کو تباہ کرنے کا موقع مل گیا، تاہم اس میں کوئی حقیقت نہیں کہ پاکستان نے امریکی ایما پر افغان جہاد میں حصہ لیا۔ پاکستان کا مقصد اپنا تحفظ تھا۔ امریکی امداد کے مختلف پہلوؤں کی جانچ پڑتال اور اس پر بحث و مباحثہ کے بعد ہمارا گروہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ پاکستان کو اپنی سالمیت کے لیے امریکی امداد قبول کر لینی چاہیے۔ صدر ضیاالحق نے تجویز مان لی۔

افغان مسئلہ پر اجلاس کے آخری روز ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل اختر عبدالرحمان اور ڈاکٹر اسرار احمد نے بالترتیب افغانستان اور مذہب کے موضوع پر خطاب کیا۔ میں نے صدر ضیا کے گھر قیام کیا تھا جہاں ہم رات 2 یا 3 بجے تک جاگتے رہتے۔ چوں کہ میٹنگ 8 بجے شروع ہوتی لہٰذا نیند پوری کیے بغیر مجھے وقت پر پہنچنا پڑتا۔ اختر عبدالرحمان کے خطاب کے دوران کچھ منٹ کے لیے میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ضیاالحق بھی اپنی کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ شام میں ضیاالحق نے مجھے بتایا کہ انہوں نے مجھے سوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں نے بھی انہیں سوتے دیکھا تھا۔ تاہم انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب سہ پہر کے وقت تھا۔ نیند کی کمی کے باعث میں دوبارہ سو گیا۔ اس دوران انہوں نے حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سود لینا، ماں کے ساتھ زنا کے برابر ہے۔ یہ سنتے ہی جاپان میں پاکستانی سفیر قمرالاسلام برہم ہو گئے اور کہا کہ ڈاکٹر اسرار نے حدیث غلط بیان کی ہے۔ ان کا موقف تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد کو یہ بیان نہیں دینا چاہیے تھا۔ ضیا نے قمرالاسلام اور ڈاکٹر اسرار احمد کے مابین بحث کے قریباً اختتام پر میٹنگ میں شرکت کی۔ چوں کہ وہ واقعہ سے لاعلم تھے، لہٰذا شام میں انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ مجھے بھی اس کا علم نہیں تھا، لہٰذا میں خاموش رہا۔ انہوں نے کہا، ''تم لازماً اس دوران سو رہے ہو گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

افغان جہاد کے دوران اہم ترین شخصیات میں سے ایک پیر عبدالقادر گیلانی نے ملاقات میں مجھے بتایا کہ افغان عوام، ضیاالحق کو ان کی حمایت کے اعتراف میں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے لیے اصل قصہ کچھ اور تھا۔ درحقیقت ضیاالحق نے پاکستانی سالمیت اور خودمختاری کے تحفظ کے لیے افغان مجاہدین کی حمایت کی تھی۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے قریباً تین سال خاموش تماشائیوں کا کردار ادا کیا۔ ان کی افغانستان کی حمایت نہ ہونے کے مترادف تھی۔ امریکی صدر جمی کارٹر سوویت یونین کے حملے سے پیدا شدہ خطرات کا اندازہ نہیں لگا سکے جس کے تحت روس نے گرم پانی پر قبضہ کرنا تھا۔ امریکہ اور اتحادی اس وقت سوویت فوجی جارحیت کے خلاف میدان میں اترے جب انہیں اندازہ ہوا کہ روس کی تقسیم کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ امریکہ کا مقصد سوویت یونین کو توڑنا تھا جب کہ علاقائی امن میں اس کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پیر عبدالقادر گیلانی کے ماتحت افغان کمانڈروں کے ضیاالحق کے حمایت یافتہ افغان گروہوں سے اختلافات ہو گئے۔ 17 اگست 1988ء کو ضیاالحق نے پیر عبدالقادر سے مسئلہ حل کرنے کے لیے ملاقات کرنی تھی مگر بدقسمتی سے اسی روز طیارہ حادثہ میں وہ جاں بحق ہو گئے۔ ضیاالحق کی وفات کے بعد کمزور پاکستانی سیاسی حکومتیں افغانستان کا مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہی۔

اگرچہ جنرل عبدالولی خان چاہتے تھے کہ ظاہر شاہ افغانستان واپس آ کر حکومت سنبھالیں تاہم شاہ خود ہی اقتدار سنبھالنے کے لیے راضی نہ ہوا۔ انہیں مرکزی شخصیت بننے کے لیے تیار کیا گیا۔ پیر عبدالقادر گیلانی نے بتایا کہ ان کا گروہ ظاہر شاہ کو متفقہ طور پر حکمران دیکھنا چاہتا تھا کیوں کہ صرف وہی متعدد افغان قبیلوں کو یکجا رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

افغانستان میں شکست سے سوویت یونین کے ٹکڑے ہو گئے۔ وسطی ایشیا، مشرقی یورپ اور دیگر ممالک کے محکوم عوام کو آزادی ملی۔ مشرقی و مغربی جرمنی ایک ہو گئے۔ امریکہ واحد سپر پاور بن گیا۔

ضیاالحق کا دورۂ روم

صدر ضیاالحق فروری 1982ء میں ایک ہفتہ کے لیے روم آئے۔ وہ خصوصی طور پر بین الاقوامی فنڈ برائے زرعی ترقی (آئیفاڈ) پر کانفرنس سے خطاب کے لیے آئے تھے۔ اس کا انعقاد روم میں آئیفاڈ کے اسسٹنٹ نائب صدر سرتاج عزیز کی خصوصی کاوشوں سے ہوا تھا۔ میری 1962ء میں سرتاج عزیز سے پروبیشنری دورانیہ ملازمت کے دوران کراچی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ پلاننگ کمیشن آف پاکستان میں تعینات تھے۔ سرتاج عزیز خوش مزاج شخص تھے۔ ان کی اہلیہ اور بیٹی پونم، اٹلی میں پاکستان کے معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ ضیاالحق کے دورۂ روم میں ہی انہیں کابینہ میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ روم قیام کے دوران ضیاالحق نے فرانس میں سفیر لیفٹیننٹ جنرل (ر) یعقوب علی خان کو ملاقات کے لیے بلایا۔ افغان مسئلہ سے درست طور پر نبرد آزما ہونے پر ناکامی کے باعث آغا شاہی کو عہدہ سے فارغ کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ آغا شاہی افغان جنگ سے پیدا شدہ دباؤ کا سامنا نہیں کر پائے تھے۔

پرتینی کا ضیا کو ظہرانہ

صدر پرتینی نے صدر ضیا کو ظہرانہ دیا جس میں اہم اطالوی و پاکستانی شخصیات نے شرکت کی۔ دونوں قائدین نے ظہرانہ کے دوران متعدد مسائل پر گفتگو کی۔ پرتینی کی سیکریٹری اور مترجم دونوں شخصیات کے مابین گفتگو کے ترجمہ میں مصروفیت کے باعث لنچ نہ کر سکی۔ جب ضیاالحق نے ''امید ہے جلد دوبارہ ملاقات ہوگی'' کہہ کر رخصت چاہی تو پرتینی نے انہیں روکتے ہوئے کہا کہ پہلے میری سیکریٹری کو کچھ کھا لینے دیں۔ ''گڈ بائے'' اور ''پھر ملیں گے'' کہنے میں مزید آدھا گھنٹہ لگا کیوں کہ اس دوران سیکریٹری کھانے میں مصروف تھی۔

ضیاالحق کی POP JOHN PAUL II سے ملاقات

سوئٹزرلینڈ میں پاکستان کے سفیر ویٹی کن کے ذمہ دار بھی تھے، لہٰذا برن میں

قائم مقام سفیر ضیا الحق اور پوپ جان پال دوم (POP JOHN PAUL II) میں ملاقات کا اہتمام کرنے روم آئے۔ بیگم ضیا الحق نے بھی پوپ دوم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ قائم مقام سفیر نے بتایا کہ پوپ خواتین سے ملاقات نہیں کرتے۔ یہ سنتے ہی بیگم ضیا الحق نے مجھ سے کہا کہ مجھے وفد میں شامل تمام خواتین کو ویٹی کن لے جانا چاہیے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور پوپ نے تمام خواتین بشمول بیگم ضیا الحق کا نہ صرف گرم جوشی سے استقبال کیا بلکہ ہمیں دعاؤں اور خصوصی اعزازات سے بھی نوازا۔

چانسری اور میرے گھر کے دروازے ہر ایک خصوصاً پاکستانی برادری کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ میری رہائش گاہ اور چانسری میں تقریب کے دوران پاکستانیوں کی کثیر تعداد صدر ضیا الحق سے ملاقات کے لیے آئی۔

میری اہلیہ پاکستانی برادری کی خواتین سے خصوصی شفقت برتتی تھیں۔ انہوں نے خود بیگم ضیا الحق اور وفد میں شامل دیگر خواتین سے ان کا تعارف کرایا۔

اٹلی کے وزیر خارجہ ایمیلیو کولمبو نے مارچ 1983ء میں پاکستان کا دورہ کیا۔ کولمبو کے دورہ سے قبل پاکستان کو اٹلی سے اقتصادی تعاون حاصل نہیں تھا۔ صرف مہنگے EXPORT CREDITS دیئے جاتے۔ میں نے اطالوی حکومت سے پاکستان کو آسان قرضے دینے کی استدعا کی جس کا آغاز 50 ملین امریکی ڈالر سے ہوا۔

میٹنگ کے آغاز پر غلام اسحاق خان نے کہا کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ کولمبو نے جواب دیا کہ برسیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے اطالوی حکومت کی جانب سے پاکستان کو 50 ملین ڈالرز کے آسان قرضے دینے کا اعلان کیا۔

روم میں سفارت کے علاوہ میں پاکستان کی جانب سے تنظیم برائے خوراک و زراعت کا مستقل نمائندہ بھی تھا۔ تنظیم کے لبنانی نژاد ڈائریکٹر جنرل ایڈورڈ سوما (EDUARD SAUMA) مغرور شخصیت کے مالک تھے۔ وہ تین بار یعنی 18 سال تک اس عہدہ پر تعینات رہے۔ بنیادی طور پر خوش مزاج شخص تھے اور تنظیم میں ان کا قابل بھروسا آدمی ایک پاکستانی خالد محبوب تھا۔ تنظیم کے انتخابات سے قبل سرتاج عزیز بھی

ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ کے امیدوار تھے اور اسی وجہ سے سوما پاکستان مخالف ہو گئے۔ میری بھرپور کوششوں کے باوجود ہم ان کا موقف بدلنے میں ناکام رہے۔ ان کی دشمنی ہاتھی کی طرح تھی۔ وہ پاکستان کو تکلیف دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ انہوں نے تنظیم میں پاکستانیوں کو ملازمت بھی نہ دی۔

انہی برسوں میں بین الاقوامی برادری واٹر مینجمنٹ کے لیے بین الاقوامی ادارے کے قیام پر غور کر رہی تھی۔ آبپاشی کی سہولیات اور تجربہ کی بنیاد پر پاکستان اس ادارے کا ہیڈ کوارٹر بننے کے لیے بہترین ملک تھا لیکن اس مقصد کے لیے سری لنکا کو چنا گیا جس کا مصنوعی آبپاشی میں کوئی تجربہ نہ تھا۔ 1984ء میں اسلام آباد میں ورلڈ فوڈ پروگرام پر کانفرنس ہوئی۔ اس میں سوما سمیت دیگر اہم شخصیات بھی شریک تھیں۔ کانفرنس کے دوران رولف کنتھم، جنہیں تنظیم کے ہیڈ کوارٹرز چننے اور تجویز کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، ضیاالحق کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پاکستان ایگری کلچرل ریسرچ کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر امیر محمد خان بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے صدر ضیا کو تجویز دی کہ کنتھم کے لیے خصوصی تمغہ کا اہتمام کیا جائے کیونکہ یہ پاکستان کے متعلق مثبت سوچ رکھتے تھے۔ بظاہر امیر محمد خان نے تجویز اس لیے دی کہ وہ نئی تنظیم میں مناسب عہدہ حاصل کر پائیں۔ ضیاالحق نے میری رائے پوچھی۔ میں نے صاف الفاظ میں کہا کہ کنتھم کا پاکستان کے حوالے سے رویہ درست نہیں، لہٰذا ان کی زیادہ خاطر مدارت نہیں کرنی چاہیے۔ صدر ضیاالحق مسکرائے اور مجھے کنتھم کو مزید بریانی پیش کرنے کو کہا۔ مجھے کسی حد تک شرمندگی ہوئی کہ ضیاالحق مجھ سے بہتر سفارت کار تھے۔

فیشن میں اٹلی کا کوئی ثانی نہیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی ٹیکسٹائل، چمڑے، ماربل اور دیگر اشیا میں بھی لاجواب ہیں۔ کرارا اعلیٰ معیار کے ماربل کے لیے مشہور ہے۔ کان کنی کے دوران پتھروں کو ایسے کاٹا جاتا ہے جیسے جنگلات کٹتے ہیں۔ چٹانیں توڑنے کے لیے ڈائنامائٹ کا استعمال نہیں کیا جاتا۔

پاکستان بھی ایسی مصنوعات تیار کرتا ہے مگر ان کا معیار بہتر نہیں ہوتا۔ اس نقطۂ

نظر سے کہ پاکستان بھی ان کے معیار کی مصنوعات تیار کر سکے اطالوی حکام نے ایک کروڑ ڈالر امداد کی ہامی بھری تا کہ معیار بہتر کر کے پاکستان اس سے کئی گنا زیادہ کما سکے۔

بدقسمتی سے میری متعدد کاوشوں کے باوجود پاکستانی حکام اس تعاون سے استفادہ نہ کر سکے۔ میری تجویز تھی کہ پاکستان کو تکنیکی ادارے قائم کرنے چاہئیں تا کہ ایسی مصنوعات کی تیاری میں مدد مل سکے جنہیں بیرونِ ممالک فروخت کرتے ہوئے بہتر زر مبادلہ کمایا جا سکے۔ روم چھوڑنے سے قبل اطالوی حکام نے کہا کہ اگر منصوبے کی لاگت پانچ کروڑ ڈالر ہوتی تو پاکستانی حکام اس کو استعمال کر لیتے۔ پاکستانی حکام نے پرواہ نہ کی کیوں کہ کل رقم ایک کروڑ تھی۔

اطالوی خوش خوراک، خوش لباس اور بہتر زندگی گزارتے ہیں۔ روم میں ہزاروں ریستوران ہیں جہاں اطالوی اور بین الاقوامی کھانے دستیاب ہیں۔ قریباً تمام مشہور فیشن ڈیزائنرز کا تعلق اٹلی سے ہے، اگرچہ ان میں سے چند ایک دیگر ممالک میں مقیم یا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے گھروں کو بھی صاف اور تمام سہولیات سے آراستہ رکھتے ہیں۔ اگر آپ کسی اطالوی کے معیار پر پورا اترتے ہیں تو وہ فوراً دوست بن جائے گا۔

وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان اطالوی ہم منصب ایمیلیو، کولمبو کی دعوت پر اٹلی آئے۔ ان کے دورہ سے پاک اٹلی تعلقات مزید بہتر ہوئے۔ صاحبزادہ نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن قید خانہ سے فرار ہو کر اٹلی کی ابروزی ماؤنٹین میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔ وہ کئی مہینے ایک اطالوی خاندان کے پاس چھپے رہے۔ بعد ازاں انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر جرمن فوج نے پکڑ کر برانشوگ (BRAUN SCHWEIG) میں قید کر دیا۔ قید اور فرار کے دوران انہوں نے اطالوی اور جرمن زبانیں سیکھ لیں۔ میں صاحبزادہ کے ساتھ ابروزی گیا جہاں خاندان کے باقی ماندہ افراد سے ملاقات کی جنہوں نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ اس دوران جذباتی مناظر دیکھے۔ وہ اطالوی جو صاحبزادہ کو ان کے فرار کے دنوں سے جانتے تھے، زار و قطار رو پڑے۔ مجھے یہ بھی پتا

چلا کہ پاکستانی صدر اور فوجی سربراہ جنرل یحییٰ خان بھی اٹلی کی جیل میں جرمن فوج کے قیدی رہے۔ وہ قید سے فرار ہو کر انڈیا (اب پاکستان) پہنچ گئے۔

یعقوب علی خان فرار اور چھپنے کے دوران اطالوی فیشن کے دلدادہ ہو گئے۔ وہ زیادہ تر ملبوسات روم سے خریدتے اور ان کے جوتے بنانے والا بھی ال گاتو نامی اطالوی تھا۔

بے تحاشا کرپشن کے باوجود اطالوی سیاستدان ملکی مفادات کو ہمیشہ مدنظر رکھتے۔ ایک بڑے اطالوی صنعتی یونٹ کے صدر نے مجھے ایک لطیفہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بار تین امیدواروں نے اعلیٰ عہدہ کے لیے درخواست دی۔ پہلا امیدوار کسی سوال کا جواب نہ دے پایا۔ دوسرے نے کہا کہ جواب دینے سے پہلے وہ اپنے باس کی خواہش کا خیال رکھے گا۔ تیسرے نے کہا کہ وہ جواب دینے سے قبل نہ صرف اپنے باس بلکہ باس کے باس کی خواہش کو بھی ذہن میں رکھے گا۔ تاہم یہ عہدہ امینتوری فنفانی (AMINTOI FANFANI) جو پانچ بار اطالوی وزیراعظم اور سینیٹ کے صدر رہ چکے تھے، کے بھتیجے کو مل گیا۔ میرے اعزاز میں الوداعی تقریب کے دوران اطالوی وزیرخارجہ اور سب سے زیادہ بار وزیراعظم رہنے والے گیولیو آندریوتی (GULIO ANDREOTTI) نے میٹنگ کے دوران ان معاشی سکینڈلز کے الزامات کا ذکر کیا جو انہیں دورانِ وزارت درپیش تھے۔

1971ء میں بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران سوویت ایئرفورس نے برقی آلات کے ذریعے پاک فضائیہ کے لڑاکا طیارے منجمد کرتے ہوئے ان کی جنگی صلاحیت کم کر دی تھی۔ پاکستان، امریکہ و دیگر ذرائع سے ایسے آلات حاصل نہ کر سکا۔ خوش قسمتی سے یہ آلات الیکٹرانیکا نامی ایک اطالوی فرم سے مل گئے۔ فضائی دفاع کا نظام بھی اطالوی فرم کونٹراوز (CONTRAVESSE) سے حاصل کیا گیا۔ اطالوی حکومت نے پاکستان کو یہ آلات خریدنے کے لیے برآمداتی قرض کے طور پر 130 ملین ڈالر دیئے۔ میں اٹلی میں سفیر ہی تھا جب اطالوی کمپنی فیاٹ اور ایک پاکستانی فرم کے مشترکہ تعاون سے الغازی

ٹریکٹرز کی بنیاد پڑی۔ اس مقصد کے لیے بھی برآمداتی قرض ملا۔

روم میں ایک واقعہ ہوا جس نے میرے پاؤں تلے زمین نکال دی۔ سیکنڈ سیکریٹری عارف ایوب چانسری کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے سفارتخانہ کے اکاؤنٹس کا ذمہ دار بھی تھا۔ عارف اچھا افسر، ذمہ دار اور معاون تھا۔ 1983ء میں پاکستان سے آڈیٹرز آئے اور اکاؤنٹس کی پڑتال کے بعد مجھ سے کہا کہ کیش بک گزشتہ بیس مہینوں سے لکھی نہیں گئی۔ یہ واقعی ایک سنجیدہ مسئلہ تھا۔ عارف ایوب ہی نہیں بلکہ مشن کے سربراہ کی حیثیت سے میں بھی ذمہ دار تھا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ عارف کو سرتاج عزیز کی بیٹی پونم سے عشق ہو گیا تھا اور انہوں نے بعد ازاں شادی بھی کر لی۔ محبت کے چکر میں وہ تمام ذمہ داریاں ادا کرنا بھول گیا۔

اخراجات کی تمام رسیدیں موجود تھیں لہٰذا کیش بک میں مہینوں کے حساب سے تمام اکاؤنٹس کا اندراج کیا گیا۔ اس کے بعد بھی بیس ہزار ڈالرز کم ہو گئے تھے جسے حذف کر دیا گیا۔ وزارتِ خارجہ میں چند افسران کی خواہش تھی کہ میں عارف کے خلاف سخت کارروائی کروں تاہم میں نے ایسا نہ کیا۔ میرا جواب تھا کہ مشن کے سربراہ کی حیثیت سے مجھ پر عارف سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لہٰذا میرے خلاف تادیبی کارروائی کی جا سکتی ہے۔

عارف نے فروری 1982ء میں ضیاالحق کے دورۂ روم سے بیشتر اور بعد ازاں بہت اچھا کام کر کے مجھے خوب متاثر کیا تھا۔ میں نے اس کی رپورٹ میں اعلیٰ ترین اے ون درجہ دیا جس کے بعد وہ ترقی پاتا ہوا متعدد ممالک میں سفیر رہا۔

سیکنڈ سیکریٹری امان اللہ لاریک بہترین افسر اور مراسم بنانے میں اچھا تھا۔ اس نے متعدد اطالوی لوگوں سے دوستی کر رکھی تھی جو سفارتخانہ کے لیے مددگار ثابت ہوتے۔ اٹالین انسٹیٹیوٹ فور مڈل ایسٹ سٹڈیز متعدد برسوں تک گندھارا تہذیب کی معلومات اکٹھی کرنے اور انہیں ترتیب دینے میں مصروف رہا تھا۔ پروفیسر تبولی GNOLI اور پروفیسر فیسینا FACCENA نے اطالوی عوام کو گندھارا تہذیب سے خوب

روشناس کرایا تھا۔ انسٹیٹیوٹ کا انتہائی عمدہ عجائب گھر تھا جہاں سوات سے بھی دستکاری کے چند نمونے لائے گئے تھے۔ میں نے آئی ایس ایم ای او کی مدد سے پاکستان پر دلچسپ لیکچرز بھی کرائے۔ راجہ ظفر الحق بھی دورۂ روم کے دوران ان میں سے ایک لیکچر میں شریک ہوئے۔

روم سے ہی مشن البانیہ میں تعلقات کا ذمہ دار بھی تھا۔ ان دنوں وہاں سوشلسٹ انتہا پسند انور ہودجا (ANWAR HODJA) کی حکومت تھی جس کے سوویت یونین سے تعلقات تھے۔ اس کی حکومت چین مخالف اور افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت کی حمایت کرتی تھی۔ افغان جہاد کی حمایت پر یہ حکومت پاکستان مخالف ہوگئی۔

البانیہ کے دارلحکومت تیرانہ، دیگر ممالک حتیٰ کہ قریبی ہمسایہ ممالک سے فضائی رابطہ بھی انتہائی مشکل ہوگیا۔ روم سے تیرانہ صرف ایک ہفتہ وار پرواز جاتی تھی۔ تاہم اٹلی میں باری اور یوگوسلاویہ میں بارتک روزانہ ایک کشتی چلتی تھی۔ میں باری تک براستہ سڑک اور وہاں سے بارتک کشتی پر گیا۔ بار سے تیرانہ تک ہمیں یوگوسلاویہ کے سنگلاخ راستوں سے گزرنا پڑا۔ یہ علاقہ اس قدر پہاڑی تھا کہ ہمیں کچھوے کی رفتار سے چلنا پڑتا۔ مجھے فلم 'یلو رولس رائس' (YELLOW ROLCE ROYCE) کا خیال آیا اور ادراک ہوا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن افواج کیوں کر یوگوسلاویہ میں ناکام ہوئیں۔ تیرانہ میں مجھے شہر کے واحد فور سٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا جہاں رہائش دنیا میں مہنگے شہروں کے اعلیٰ ہوٹلوں کی قیمتوں سے بھی زیادہ تھی۔

میری آمد سے کچھ دیر بعد ہی پروٹوکول چیف ملاقات کے لیے آئے اور شہر دکھانے لے گئے۔ انہوں نے مجھے خوبصورت مسجد اور اتنا ہی دلچسپ کلیسا دکھاتے ہوئے کہا کہ البانیہ میں مذہبی رسومات کی ادائیگی پر پابندی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انتظامیہ نے مساجد اور کلیسا سیل کر دی ہیں۔ میں نے کہا کہ حکومت نے صرف عمارتیں مقفل کی ہیں تاہم لوگوں کے دلوں پر تالے نہیں لگا سکی جو بہت زیادہ عقیدت مند اور خفیہ طور پر مذہبی رسومات ادا کرتے تھے۔ سوویت یونین میں مذہب کی پُرزور واپسی ہوئی اور

سوویت حکام اسے کچلنے میں ناکام رہے۔ پروٹوکول چیف حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے کوئی جواب نہ دے سکے۔

صدر انور ہودجا کی جانب سے میرے وضاحتی خط پر مبنی تقریب حیران کن طور پر دوستانہ ماحول میں تھی۔ تقریر کے دوران میں نے افغانستان پر پاکستان کا موقف واضح الفاظ میں بیان کیا۔ میں نے افغان عوام کے خلاف سوویت جارحیت پر شدید تنقید کی۔ ساتھ ہی چین سے دوستی کی بھی تعریف کی۔ میرا خیال تھا کہ انور ہودجا ماضی کی طرح اپنی تقریر میں بھی پاکستان کو آڑے ہاتھوں لیں گے جب کہ اس کے برعکس انہوں نے پاکستان کی افغان پالیسی اور چین سے دوستی پر کوئی تنقید نہ کی۔ انہوں نے پاکستان اور دونوں ممالک میں تعلقات کے حوالے سے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

تقریب کے بعد پروٹوکول چیف نے متعدد وزراء بشمول وزیر خارجہ تجارت سے ملاقات کرائی۔ وزیر خارجہ تجارت کے دفتر کی تین دیواروں پر الماریوں میں شراب کی بوتلوں کے ڈھیر تھے۔ ہماری گفتگو کا محور برآمدات خصوصاً البانیا کی بنی شراب کی برآمدات تھا۔ میں نے وزیر سے البانیا کی بہترین شراب کے بارے میں دریافت کیا۔ جواب میں وزیر نے ایک قصہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ ایک بار البانیا میں شراب بنانے والے مشہور شخص نے بستر مرگ پر اپنے بیٹوں کو بلایا اور انہیں شراب بنانے کی تمام تراکیب بتادیں۔ آخری سانس لینے سے قبل اس نے بتایا کہ ان تراکیب کے علاوہ ایک اور ترکیب بھی ہے اور اس کے ذریعے انگوروں سے بھی شراب کشید کی جاسکتی ہے۔ اس واقعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان دنوں بیشتر ممالک کیمیائی عناصر سے شراب بناتے تھے۔

تیرانہ میں زبوں حالی تھی کیوں کہ عوام روزمرہ ضروریات سے بھی محروم تھے۔ حتیٰ کہ روٹی کی بھی قلت ہو جاتی اور میں نے وہاں مختصر قیام کے دوران لوگوں کو روٹی کے لیے لڑتے دیکھا۔ خوبصورت ساحل ویران تھے۔ اس کے باوجود البانیا کے عوام دل کے لیے مفید زیتون کا تیل استعمال کرنے کے باعث درازعمر تھے۔

سفارت کاروں کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا اوران کا زیادہ وقت خوش گپیوں میں ہی گزرتا۔ تیرانہ میں کسی سفیر یا سفارتکار کی آمد کے وقت جشن کا سماں ہوتا۔ ایسی شخصیات کے لیے ظہرانوں اور عشائیوں کا اہتمام کیا جاتا۔ میں جتنے بھی سفراء سے ملا، ان سب نے کھانے کی دعوت دی۔ چین تا حال معاشرتی انقلاب سے گزر رہا تھا، اسی لیے چینی سفیر مجھے یونیفارم میں ملے۔ انہوں نے بھی تیرانہ میں درپیش دگرگوں حالات کا ذکر کیا۔ کسی ایسے ملک کے باسی سے یہ سننا جہاں خود زندگی کٹھن ہو، حیران کن تھا۔

اطالوی سفیر کی اہلیہ مصری نژاد تھیں۔ سفیر کے ساتھ ڈنر کے بعد ان کی اہلیہ نے پوچھا کہ اب میں البانیا آتا رہوں گا۔ میں نے کہا کہ ہمارے مشن کے ذمہ جو دیگر ممالک ہیں، وہاں ضوابط کے مطابق ہم سال میں صرف دو بار جا سکتے ہیں اور اس کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کبھی کبھار ہی (off and on) آسکوں گا۔ اس پر خاتون نے برجستہ کہا کہ جی ہاں on سے زیادہ off۔

تیرانہ سے روم واپسی تیرانہ آنے سے بھی زیادہ مشکل تھی۔ میرا ڈرائیور کیروٹی سمندر سے خائف تھا اور کشتی میں سفر کے دوران ہمیں طوفان اور اس کے نتیجہ میں ہچکولوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ لہٰذا ہم نے یوگوسلاویہ سے شمالی اٹلی اور پھر روم کے لیے متبادل راستہ اپنایا۔ واپسی کے سفر میں ہمیں کئی بار رکنا پڑا کیوں کہ خوراک کی قلت کے خلاف احتجاج کے باعث سڑکیں بند ہو جاتی تھیں۔ سڑکیں تنگ ہونے کے باعث رفتار سست رکھنا پڑی اور اسی لیے ہمیں ایڈریاٹک کے ساحل پر واقع خوبصورت وقدیم شہر ڈبروونک (DUBROVONIK) میں قیام کا موقع مل گیا۔ اگلی صبح ہم نے روم تک سڑکوں کی حالت دریافت کرنا چاہی تو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ شدید برف باری کے باعث سڑکیں بند تھیں۔ چاروناچار ہمیں اسی راستے سے جانا پڑا جو ہم نے یوگوسلاویہ سے بار جانے کے لیے اپنایا تھا۔ شام ہوگئی اور ہم بھوکے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک مسلم ریستوران مل گیا جہاں تازہ دنبہ بھنا جا رہا تھا۔ یہ اس قدر لذیز تھا کہ ہم نے اس سے پیشتر یا بعد میں ایسی خوراک نہیں کھائی۔

ہمیں باری سے بار تک پہنچانے والی کشتی نئی اور سمندر بھی پُر سکون تھا۔ اس کے برعکس ہمیں اب پرانی کشتی اور برہم لہروں کا سامنا تھا۔ کیروٹی اس قدر خوف زدہ تھا کہ وہ میرے کیبن میں آ کر آہ و بکا کرنے لگا کہ کشتی لہروں کا سامنا نہ کرتے ہوئے کسی بھی وقت ٹوٹ جائے گی۔ اسے مطمئن کرنے کی میری تمام کاوشیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اپنے ساتھ اس نے مجھے بھی ساری رات جگائے رکھا۔ روم میں سفیر کو تیرانہ کے معاملات کا ذمہ دار ٹھہرانا حقیقت پسندانہ فیصلہ نہ تھا۔ بہتر ہوتا اگر یوگوسلاویہ میں مشن کو البانیا کی ذمہ داری بھی دی جاتی۔ میں نے وزارتِ خارجہ کو تجویز دی کہ تیرانہ میں تعلقات کی ذمہ داری بلغراد میں موجود مشن کو دی جائے جسے مان لیا گیا۔ البانیا کو یوگوسلاویہ سے منسلک کر دیا گیا اور روم کو مالٹا کی نئی ذمہ داری دے دی گئی۔ روم سے مالٹا بآسانی پہنچا جا سکتا تھا۔ ایلیٹیلیا اور ایئر مالٹا روزانہ روم اور مالٹا کے لیے پرواز کرتی تھیں۔ پی آئی اے کا ایئر مالٹا سے خاص ناتا تھا کہ نہ صرف اسے پاکستان ایئر لائنز سے تکنیکی مدد مل رہی تھی بلکہ چند پاکستانی پائلٹ ہی ایئر مالٹا کے جہاز اڑاتے۔

مالٹا میں خشک موسم سے موسم برسات میں تبدیلی کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ گرما میں صحرا جیسا ملک برسات شروع ہوتے ہی سرسبز و شاداب ہو جاتا اور ہر جگہ مالٹے اور دیگر پھل دکھائی دیتے۔

ایڈمرل نیازی، روم اور دیگر اطالوی شہروں کے سرکاری دورہ پر آئے۔ ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ اطالوی نیول چیف سے ملاقات کے علاوہ انہوں نے اہم مقامات بشمول شپ یارڈ اور بحریہ کے لیے تیار کیے جانے والے سامان کی فیکٹریوں کا دورہ کیا۔ پاکستان ان دنوں جنگی بحری جہاز خریدنے کا خواہش مند تھا۔ ایسے جہاز فریگیٹس (FRIGATES) کہلاتے اور ان میں میزائل سے بچنے کی صلاحیت ہوتی۔ میں نے شپ یارڈ کے صدر سے پوچھا کہ فریگیٹس میں نصب دفاعی نظام میزائل حملہ کے خلاف 100 فیصد کارآمد ہے۔ انہوں نے کہا کہ دشمن کے میزائل سے 100 فیصد نہیں بچا جا سکتا۔

میں نے سوچا کہ آیا پاکستان کو ایسے فریگیٹس خریدنے چاہئیں جن کے ممکنہ

جنگ میں تباہ ہونے کا خدشہ ہو۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ پاکستان کو دفاعی سامان کی تیاری میں خودمختار ہونا چاہیے۔

چیف آف جوائنٹ چیفس آف سٹاف جنرل محمد اقبال اطالوی ہم منصب کی دعوت پر روم آئے۔ ان کا بھرپور استقبال ہوا اور ملٹری تنصیبات کا دورہ بھی کرایا گیا۔ اس دوران وہ تورینو میں فیاٹ (FIAT) اور بحیرہ ایڈریاٹک میں اطالوی دفاعی تنصیبات بھی دیکھنے گئے۔

جنرل اقبال کا اپنے اے ڈی سی سے سلوک انتہائی ناروا تھا۔ وہ اسے دیگر افراد بشمول اطالوی میزبانوں کے سامنے بھی جھڑکتے اور گالیاں دیتے۔ تاہم وہ شاپنگ کے معاملہ میں خاصے محتاط تھے اور اس مقصد کے لیے مختلف مقامات پر جانے کے باوجود وہ خالی ہاتھ لوٹتے۔

میری اٹلی تعیناتی سے قبل دونوں ممالک کی افواج میں تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا کہ جنرل نیازی اور جنرل اقبال نے الگ سے اٹلی کے دورے کیے جس سے دونوں ممالک کی افواج مزید قریب آئیں اور دیگر اعلیٰ سطحی دورے بھی ہوئے۔ اطالوی آرمی چیف جنرل کپوزو اور ایئر چیف اپنے ہم منصب کی دعوت پر پاکستان آئے جس سے دونوں ممالک کی افواج مزید قریب ہوئیں۔

اٹلی میں دوطرفہ تعلقات کی بنیاد پر بیرون ممالک کے سفراء بہ شرط یہ کہ وہ وہاں پانچ سال گزار چکے ہوں، کے اعزاز میں قومی سطح پر تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ پاکستان اور اٹلی کے تعلقات میں بہتری اور قربت کے لیے میری خدمات کے صلہ میں اطالوی حکومت نے مجھے پانچ سال پورے کیے بغیر ہی اٹلی کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا۔

اٹلی میں پاکستانی برادری نے پاکستان ایسوسی ایشن بنا رکھی تھی جو مختلف تقریبات منعقد کرتے جن سے سفارتخانہ کو بہت مدد ملتی۔ اس نے اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے ضرورت مند پاکستانیوں کی بھی مدد کی۔ سرتاج عزیز اور ان کی فیملی نے بھی ایسوسی ایشن کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ روم میں مقیم پاکستانی بزنس مین

ایس اے نقوی اور ان کی فیملی متحرک ترین ممبران تھے۔ ایسوی ایشن کی اکثر تقاریب ساحل کنارے ان کے عالیشان گھر میں ہوتیں۔

ضیاالحق آئی ایف اے ڈی اجلاس میں ظافر کو ساتھ لے گئے۔ تنظیم کے سعودی نژاد صدر سندیری نے گاڑی سے اترتے ہوئے صدر ضیاالحق کو دیکھا تو انہیں ڈائس پر لے گئے۔ چوں کہ ضیا الحق کی گود میں ظافر تھا تو وہ اسے بھی ڈائس پر ساتھ لے گئے۔ سرتاج عزیز نے ظافر کو روکنے کی کوشش کی تو ضیاالحق نے انہیں منع کر دیا۔

اطالوی وزیر خارجہ کولمبو، سٹیٹ منسٹر کورتی اور دفتر خارجہ کے سیکریٹری جنرل و سفیر MALFATTI کے ساتھ میرے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ کولمبو نے ایک بار مجھے علی الصبح ناشتے پر مدعو کیا۔ ان کے دفتر سے ہم شہر کے وسط میں واقع اطالوی پارلیمان کے قریب کیفے میں گئے۔ ایسپریسو کافی اور بریوش (رول) سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پاک اٹلی تعلقات پر گفتگو ہوئی۔ میں کامرس منسٹر زاہد سرفراز کی ہدایت پر کمرشل سیکشن بند کیا گیا۔ وہ باری میں صنعتی میلہ میں شریک ہونا چاہتے تھے تاہم سفارتخانہ نے ان کی حوصلہ شکنی کی۔ اگر چہ یہ میلا ان جتنا بڑا تو نہیں مگر پھر بھی دوسرا بڑا صنعتی میلہ تھا۔ اگر مشن کا سربراہ میں ہوتا تو کامرس منسٹر کو ضرور دعوت دیتا تاکہ انہیں اندازہ ہوتا کہ پاکستانی کون سی مصنوعات اٹلی برآمد کر سکتے ہیں۔ کمرشل اور اقتصادی اعتبار سے اٹلی کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے میں نے حکومت پاکستان سے استدعا کی کہ روم میں کمرشل کونسلر کی سطح پر کمرشل سیکشن قائم کرتے ہوئے خالد امین کو اس کا سربراہ مقرر کیا جائے جو بون میں مدت ملازمت پوری کر کے پاکستان تبادلہ کے منتظر تھے۔

میرے روم آتے ہی باری میں صنعتی میلے کا انعقاد ہوا جس میں پاکستان نے بھی شرکت کی۔ میں بمع اہل وعیال انتہائی گرمی میں براستہ سڑک وہاں پہنچا۔ میلہ خاصا بڑا اور پاکستانی نقطہ نظر سے دلچسپ تھا۔ پاکستانی تاجرین کی تعداد کم تھی تاہم انہوں نے اچھا کاروبار کیا اور بڑے آرڈر حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ ہمیں ایک مناسب سائز کے فیملی ریستوران میں لنچ کا بھی موقع ملا جو کھانوں کے حوالے سے خاصا مقبول

تھا۔ ریستوران مالکان اطالوی میاں بیوی نے ہمیں ریستوران خصوصاً باورچی خانہ دکھایا جہاں صفائی کا اعلیٰ معیار دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ میری اہلیہ نگہت اور بچے بینا اور ظافر بھی ساتھ تھے۔ ظافر کم عمر اور کھیل کود کا شوقین تھا۔ اسے اچھل کود سے روکنے کی غرض سے میں نے با آواز بلند ایسا لفظ بولا جو میرے خیال میں اس کے فہم سے بالا تر تھا۔ بدقسمتی سے اسے سمجھ آگئی اور غصے میں اس نے میری عینک، بٹوہ، قلم، رومال اور جو کچھ بھی اس کے ہاتھ لگا اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ ہم بہت مشکل سے اس کے غصے پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔

جب میں جرمنی میں سفیر تھا تو پاکستان میں اٹلی کے سفیر امیدیو ڈی فرانسس تھے۔ پاکستان میں غیر ملکی سفراء کو خدمات کے بدلے اعزاز سے نوازنے کا رواج نہیں تھا۔ چوں کہ مجھے بطور سفیر حکومت اٹلی نے اعزاز سے نوازا تھا، لہٰذا پاکستان میں اطالوی سفیر کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے صدر ضیاالحق سے درخواست کی کہ انہیں کسی تمغہ سے نوازا جائے۔ میری تجویز مان لی گئی اور انہیں اعزاز دیا گیا۔ یہ تقریب ایوانِ صدر راولپنڈی میں ہوئی جس کے آخری رہائشی فضل الٰہی چودھری تھے۔ تقریب میں چند آرمی افسران بھی شامل تھے جن کے سینے تمغوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ازراہِ مذاق ان میں سے ایک افسر کو کہا کہ سول افسر ملک کے لیے کوئی بھی قربانی دے اسے کوئی تمغہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس ایک فوجی فرنٹ لائن پر بنکر میں ہی بیٹھا رہے تو اسے بہادری پر تمغے ملتے ہیں۔ وہ افسر میری بات سن کر تلملا گیا۔ تاہم، یہ جانتے ہوئے کہ میں صدر ضیا الحق کا فرسٹ کزن ہوں، خاموش رہا۔

روم میں ہمارا وِلا خاصا قدیم تھا جس میں پرانی لفٹ لگی ہوئی تھی۔ ایک روز لفٹ دو منزلوں کے درمیان میں رک گئی اور بینا اس میں پھنس گئی۔ ہم سہم گئے مگر اسے کسی طرح نکال لیا گیا۔

اے کے بروہی مذہبی تحمل مزاجی پر کانفرنس میں شرکت کے لیے روم آئے۔ ہم نے انہیں رہائش گاہ پر عشائیہ دیا۔ ڈنر کے بعد انہوں نے کہا کہ اس ولا پر غیبی قوتوں کا

سایہ ہے۔انہوں نے ان بدروحوں کو نکالنے کی پیشکش کی۔میرے طنزیہ انداز کا ادراک کرتے ہوئے انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔دوافراد ایک ٹرین میں ساتھ بیٹھے تھے۔ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ وہ جنات پر یقین رکھتا ہے۔دوسرے شخص نے نفی میں جواب دیا۔جیسے ہی اس نے ''نہ'' کہا،سوال پوچھنے والا شخص غائب ہوگیا۔

1976ء میں ڈاکا رجاتے ہوئے راستے میں میلان رکا۔اعزازی کونسل جنرل VIJEVANO مجھے ایک جوتوں کی فیکٹری VIGENS لے گئے۔جس کا مالک (جیوون بلاندینا) GIVANE BLANDINA امریکہ اور یورپ میں اعلیٰ برانڈز کے جوتے فروخت کرتا تھا۔میری اس سے دوستی ہوگئی اور پھر میں جوتے لینے وہیں آیا کرتا۔ایک بار میں نے اس سے بچوں کا پوچھا تو اس نے کہا کہ بیوی سے تو میرے دو بچے ہیں لیکن یہ اندازہ نہیں کہ باقی خواتین کے بطن سے کتنے ہیں۔ہر متمول اطالوی کی طرح اس کے تین گھر تھے۔ایک وجیوانو،دوسرا پہاڑوں اور تیسرا ساحل پر تھا۔

1982ء میں کرسمس کی شام مجھے معلوم ہوا کہ پوپ جان پال دوم ویٹی کن میں کرسمس تقریب کی صدارت کریں گے جہاں دنیا بھر سے تمام عیسائی ایک ہزار ڈالر فی کس دے کر شریک ہوں گے۔شام کو وہاں ہجوم ہونے سے قبل میں نے ڈرائیور کو ویٹی کن چلنے کا کہا۔ویٹی کن کے باہر اطالوی پولیس پہرہ دے رہی تھی۔پولیس انچارج نے کہا کہ وہ مجھے وہاں تک لے جاسکتا ہے جہاں تک اٹلی کا حصہ ہے،تاہم اس سے آگے نہیں۔ویٹی کن،پوپ کے زیرانتظام تھا۔پولیس انچارج نے ویٹی کن کے پروٹوکول چیف کو میری آمد کی اطلاع دے دی جو فوراً مجھ سے ملنے چلا آیا۔رواج یہ تھا کہ ویٹی کن سے وابستہ سفیر ہی تقریب میں شرکت کرسکتا ہے۔چوں کہ وہ مجھے جانتا تھا لہٰذا اندر لے گیا اور وہاں نشست دی جہاں دیگر مسلمان ممالک کے سفراء بھی موجود تھے۔میں پوپ جان پال دوم کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔میں صدر ضیاالحق کے ساتھ پہلے ہی پوپ سے ملاقات کرچکا تھا اس لیے پاپ نے مجھے پہچان لیا۔یہ تقریب قریباً تین گھنٹے جاری رہی اور اس دوران میں مسلسل پوپ کے سامنے بیٹھا رہا۔

میں نے بمعہ اہل وعیال اکتوبر 1981ء کو فریضہ حج ادا کیا۔ روم میں سعودی سفیر خالد الترکی سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہم نے حج سے چند روز قبل ہی یہ فریضہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سعودی سفیر نے نہ صرف بلا تاخیر ویزہ دیا بلکہ سعودی ایئرلائنز میں سیٹیں بھی دلوا دیں۔ میرے پاس بینک سے رقم نکلوانے کی فرصت بھی نہ تھی۔ میری اہلیہ کے پاس صرف 1000 ڈالرز تھے۔ میں نے صدر ضیا الحق اور سعودی عرب میں چند دوستوں کو فون کیا۔ مدینہ منورہ میں ہم پاکستان ہاؤس ٹھہرے جو مسجد نبوی ﷺ کے بالکل سامنے تھا۔ ظافر چھوٹا تھا، لہٰذا مجھے حج کے دوران ہر وقت اسے گود میں اٹھانا پڑا۔

ہمارے اطالوی ڈرائیور کیروٹی کو حکومت پاکستان نے اعزاز سے نوازا۔ اسے پاکستان میں بطور حکومتی مہمان بھی مدعو کیا گیا۔ وہ فضائی سفر سے ڈرتا تھا جس کے باعث اس پیشکش سے استفادہ نہ کر سکا۔

جب اٹلی میں مَیں سفیر مقرر ہوا تو روم میں ڈی ایم جی افسر تنویر شیخ کی بطور زرعی کونسلر تعینات تھا۔ میں سفیر کے ساتھ ساتھ ایف اے او (FOOD AND AGRICULTURAL ORGANIZATION)، ڈبلیو ایف پی (WORLD FOOD PROGRAM) اور آئی ایف اے ڈی (INTERNATIONAL FUND FOR AGRICULTURAL DEVELOPMENT) کی مستقل نمائندگی بھی کرتا تھا۔ تنویر میرا ڈپٹی ہونے کے ناتے ان تمام تنظیموں کے مستقل نمائندہ کا متبادل بھی تھا۔ وہ قابل افسر ہونے کے ساتھ مذکورہ تنظیموں کے معاملات میں بھی بھرپور شرکت کرتا۔ اس کے بعد دوسرا ڈی ایم جی افسر سابق صدر پرویز مشرف کا بڑا بھائی جاوید مشرف تھا۔ ان کے والد مشرف الدین وزارتِ خارجہ میں سیکشن افسر تھے اور کچھ عرصہ کے لیے مجھ سمیت دیگر پروبیشنرز کا خیال بھی رکھتے رہے۔

خالد امین دل لگا کر کام کرتا۔ ہم نے روم اور دیگر مقامات پر اطالوی کا مرس د

صنعتی کارخانوں کا دورہ کیا۔ میرے دورِ سفارت میں پاکستان کی اٹلی کو برآمدات اور ملک میں اطالوی سرمایہ کاری بڑھی۔ تجارتی نمائشوں کے دوران پاکستان کی نمائندگی میں بھی اضافہ ہوا۔ میلان تجارتی میلہ میں پہلی بار پاکستان میں اطالوی سرمایہ کاری پر اجلاس میں کثیر تعداد نے شرکت کی۔ یہ اٹلی میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا میلہ تھا۔ چیئرمین ایکسپورٹ پروموشن بیورو پاکستان اور صف اوّل کے صنعتکار حمید حبیب نے کانفرنس میں خطاب کیا۔

سردینا(SARDINIA) میں کیلیغریز (CALLIGRI) ٹریڈ فیئر اس حوالے سے بہت اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں پاکستانی ایکسپورٹرز کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ سردینا اپنے مشہور ایمرلڈ ساحل کے باعث بھی مشہور ہے جہاں آغا خان کے سات خوبصورت ہوٹل تھے۔ متمول افراد اہل وعیال یا گرل فرینڈز کے ساتھ وہاں چھٹیاں گزارنے آتے تھے۔ ایسی سیرگاہوں پر تصویریں اتارنا سختی سے منع تھا۔ سردینا، ونیلا کی پیداوار میں بھی مشہور ہے جس کی یہاں بہتات ہے۔ لوگ چائے کو خوشبودار بنانے کے لیے اس میں ونیلا استعمال کرتے۔

1979ء میں پُرتشدد ہجوم نے اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے کو نذرِ آتش کردیا۔ سفارتخانہ کے عملہ نے آگ سے محفوظ کمرے میں پناہ لی۔ کسی نے ضیاالحق کو راولپنڈی کے راجہ بازار سائیکل پر جانے کا مضحکہ خیز آئیڈیا دیا۔ امریکی سفارتخانہ سے شعلے اٹھ رہے تھے اور ضیاالحق سائیکل سواری کے باعث اس کو رکنے کا حکم نہ دے سکے۔ امریکی سفارتخانہ نذرِ آتش کرنے کا واقعہ مجھے امریکی سفارتخانہ کی سیکریٹری مارٹین نے سنایا جن کا اسلام آباد سے روم تبادلہ ہوا تھا۔

پی آئی اے کے ڈائریکٹر مارکیٹنگ مسٹر خورشید اور ان کے دیگر ساتھیوں نے میری روم اور بون میں بطور سفیر تعیناتی کے دوران خوب مدد کی۔ انہی کے وسیلے سے مجھے کینو، آم اور جھینگے ملتے تھے۔

بارہواں باب

جرمنی میں بحیثیت سفیر تبادلہ

1984ء کے موسم بہاراں میں صدر ضیا الحق براستہ روم گنی کے شہر کونکری (CONACKRI) پہنچے جہاں انہوں نے سکووتوری کے جنازہ میں شرکت کرنا تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں روم میں بطور سفیر تین سال مکمل کر چکا ہوں اب کسی اور جگہ تعیناتی کا وقت آگیا ہے۔ ضیا الحق نے کہا کہ میں چوتھا اور پانچواں سال بھی روم میں گزار سکتا ہوں۔ چند ہفتوں بعد ہی مجھے اطلاع ملی کہ میرا تبادلہ بون ہو گیا ہے۔

بون میں ہمارے سفیر ایس اے ڈی بخاری بہت نرم مزاج شخص تھے اور کراچی میں پروبیشنری عرصہ کے دوران وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری آفس میں افسر کی حیثیت سے انہوں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ چوں کہ مسٹر بخاری کے بارے میری رائے مثبت تھی لہٰذا میں نے صدر ضیا الحق کو فون کیا کہ ان کا قبل از وقت تبادلہ مناسب نہیں۔ ضیا الحق نے پوچھا کہ میں بخاری کو کب سے جانتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ جب وہ کونسلر ہوا کرتے تھے۔ ضیا الحق نے جواب دیا کہ بعض لوگوں کی کارکردگی اس وقت تک ہی عمدہ رہتی ہے جب تک وہ ماتحت ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی کے ماتحت نہیں رہتے تو ناکام ہو جاتے ہیں۔ ایک بار پھر میں وفاقی جمہوریہ جرمنی میں پاکستان کا کم عمر ترین سفیر تعینات ہوا۔ ایک روایت ہے کہ وداع ہونے والا سفیر اپنی جگہ لینے والے کی مدد و

رہنمائی کے لیے سفارتخانہ سے وابستہ دیگر ممالک کی رپورٹ لکھتا ہے۔ میں دسمبر 1963ء تا جون 1967ء بون میں سیکنڈ سیکریٹری اور دس سال بعد اگست 1977ء تا جون 1981ء وزیر رہ چکا تھا، میری سوچ کے مطابق اس رپورٹ کو پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ میں نے تجسس کے باعث رپورٹ کو ایک نظر دیکھا۔ اس میں جرمن سٹیٹ سیکریٹری ڈاکٹر میئر لینڈرت کو مغرور اور پاکستانی مفادات مخالف قرار دیا گیا تھا۔ پروٹوکول چیف سے ملاقات کے بعد میں نے ڈاکٹر لینڈرت سے ملاقات کا وقت لیا۔ ان کے دفتر پہنچنے پر پروٹوکول افسر نے مجھے لاؤنج میں انتظار کا کہا اور سٹیٹ سیکریٹری کو بتانے چلا گیا۔ وہ ایک میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے مگر اس کے باوجود مجھ سے فوراً ملنے چلے آئے اور یورپی رواج کے مطابق گلے ملتے ہوئے میرے دونوں گالوں پر بوسہ دیا۔ یہ بہترین شروعات تھی۔

انہوں نے جرمنی آمد پر خوش آمدید کہا، نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ وہ دفتر خارجہ میں سٹیٹ سیکریٹری تعینات ہونے سے قبل ماسکو میں سفیر رہ چکے تھے۔ وہ نسلی جرمن اور بالٹک جمہوریہ ریاستوں سے تعلق رکھنے کے باعث روانی سے روسی زبان بولتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سوویت ریاستوں میں سے ایک ریاست کے دورے کے دوران انہیں کسی قصبہ میں داخلہ سے روک دیا گیا۔ چوں کہ انہیں روانی سے روسی زبان آتی تھی لہٰذا انہوں نے اپنی گاڑی کے گرد جمع لوگوں سے بات کی۔ انہیں بتایا گیا کہ افغانستان میں ہلاک ہونیوالے روسی سپاہیوں کی لاشیں آبائی قصبے میں تدفین کے لیے پہنچی ہیں۔ لوگ افغانستان میں جنگ کے خلاف اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ روس کی افغانستان میں مداخلت کے خلاف تھے جو ان کے خیال میں بلاوجہ تھی۔ لینڈرت نے ان مشاہدات کے پیش نظر کہا کہ سوویت یونین جنگ جاری نہ رکھ سکے اور فوج واپس بلالے گی۔

اس کے بعد میں سٹیٹ سیکریٹری برائے اقتصادی معاملات مسٹر سدھوف (SUDHOFF) سے ملا جنہوں نے نوجوانی کی یاد تازہ کردی جب ہم اکٹھے پارٹیوں پر

جایا کرتے تھے۔

بون میں سیکنڈ سیکریٹری اور وزیر کی حیثیت سے میں نے متعدد جرمنوں سے تعلقات استوار کر لیے تھے جو میری وہاں بطور سفیر تعیناتی تک اعلیٰ عہدوں پر فائض ہو چکے تھے۔ وہ پاکستان کو مثبت نگاہ سے دیکھتے تھے جس کے باعث ہمیں اپنے مفادات کے فروغ میں مدد ملی۔

متعدد یورپی باشندوں کی طرح 13 کا ہندسہ میرے لیے بھی منحوس ہے۔ جرمنی اور پاکستان، صدر ضیاالحق کے دورہ بون پر راضی ہوئے اور دونوں ممالک میں یہ اعلان مہینے کی 13 تاریخ کو کیا گیا۔ چوں کہ دعوت نامہ چانسلر کوہل کی جانب سے تھا لہٰذا وزیراعظم جونیجو نے کہا کہ صدر کی بجائے انہیں جرمنی جانا چاہیے۔ ضیاالحق نے جونیجو کو جانے دیا۔ اس دوران دونوں کے مابین اختلاف جنم لے چکے تھے۔ جونیجو ویسے تو ضیاالحق کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، اس لیے انہوں نے اوچھے طریقہ سے انتقام لینے کا سوچا۔

جونیجو کا دورہ ٹھیک رہا اور ان کا شایانِ شان استقبال بھی ہوا لیکن میں مسلسل ان کے زیرِ عتاب رہا۔ وہ جرمن حکام کو بھی متاثر نہ کر سکے کہ انہیں اوسط درجے کے ذہن کا شخص تصور کیا گیا۔ جونیجو کے وفد میں بیگم کلثوم سیف اللہ واحد خاتون تھیں۔ وفد کے چند ممبران کی مخالفت کے باوجود میں نے انہیں مکمل پروٹوکول اور تمام معاملات میں وہی مقام دیا جس کی وہ مستحق تھیں۔

میونخ ایئرپورٹ پہنچنے پر جونیجو کو سلامی پیش کی گئی جس کے بعد جرمنی، پاکستان اور بویریا کے قومی ترانے نشر ہوئے۔ وہاں نصب ایک بورڈ پر لکھا تھا، ''آزاد ریاست بویریا۔'' بویریز کا قومی ترانہ اور اس بورڈ نے جونیجو کو حیران کیا۔ یہ دونوں حقائق جرمنی کے وفاقی یونٹس کی خودمختاری کے ثبوت تھے۔

میں نے جونیجو کو بتایا کہ جرمنی میں مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد میں قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے پاکستانی عوام کی خدمت کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان کا

جواب کسی حد تک تنقیدی تھا۔ 1988ء کے انتخابات میں وہ قومی اسمبلی کی نشست پر کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ہم دونوں 1990ء میں ممبران قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ ایک روز جونیجو کے ساتھ نشست پر بیٹھے ہوئے میں نے انہیں جرمنی میں کی گئی بات یاد دلائی۔ خدا مہربان تھا اور انتخابات کے بعد میں قومی اسمبلی میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جونیجو شرمندہ تو ہوئے، تاہم کوئی جواب نہ دیا۔

اپریل 1987ء میں جونیجو نے وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے یورپی ممالک میں پاکستانی سفراء کی لندن میں میٹنگ بلائی۔ پہلے سیشن میں ہی انہوں نے ضیاالحق سے دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے فضول باتوں پر مجھے تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ 1986ء میں دورۂ جرمنی کے دوران مشن کی عمدہ کارکردگی دیکھ چکے تھے۔ سننے میں آیا کہ کسی پاکستانی نے لندن میں جونیجو کو شکایت کی کہ ہیمبرگ میں معمولی میلہ کے دوران بون میں پاکستانی مشن کے ممبران غیر حاضر تھے۔ جونیجو نے غصے سے پوچھا کہ پھر سفارتخانہ کیا کرتا رہتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جرمنی میں سینکڑوں چھوٹے بڑے میلے ہوتے ہیں جن میں سفارتخانہ شرکت نہیں کرتا۔ بون میں سفارتخانہ نے شرکت کے لیے جرمن حکومت کی امداد سے گیارہ اہم اور مشہور میلوں کا انتخاب کیا ہے جب کہ حکومت پاکستان مالی مسائل کے باعث امداد بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سفارتخانہ کی کاوشوں کے باعث پاکستان کی جرمنی کو برآمدات میں 30 فیصد اضافہ جبکہ اقتصادی تعاون اور سرمایہ کاری میں بھی بہتری آئی ہے۔ کامرس منسٹر ڈاکٹر محبوب الحق اور دوسرے وزراء اس میٹنگ میں شامل تھے، انہوں نے جونیجو کو کہا کہ سفیر وحید کی کارکردگی بہت عمدہ ہے اور اس کو سراہا جائے۔ جرمنی میں سفیر کی کارکردگی لائق تحسین ہے۔ جونیجو شرمسار ہو گئے مگر ان کے دل میں میرے خلاف زہر کم نہ ہوا۔ بعدازاں سیکریٹری خارجہ عبدالستار جو جونیجو کو میرے خلاف بھڑکا رہے تھے، نے بادل نخواستہ اعتراف کیا کہ میں نے احسن طریقے سے اپنا دفاع کیا۔

نیاز اے نائیک اس وقت پیرس میں سفیر تھے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اور فرانس میں تجارت مساوی ہو چکی ہے۔ محبوب الحق کے فرانس سے سالانہ تجارت

دریافت کرنے پر نائیک نے جواب دیا 30 ملین ڈالرز جس پر محبوب الحق نے کہا کہ یہ قبرستان کا بیلنس ہے۔ اس وقت جرمنی کے ساتھ پاکستان کی تجارت اربوں ڈالرز میں تھی۔

چیف آف جوائنٹ چیفس آف سٹاف جنرل رحیم الدین سرکاری دورہ پر جرمنی آئے۔ جرمن حکام نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا، مختلف مقامات کا دورہ کرایا اور اہم موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ دورہ کے دوران رحیم الدین نے دو بڑی غلطیاں کیں۔ جرمن فوج نے رات کو ہینور (HANOVER) کے قریب بہت بڑی جنگی مشقوں کا اہتمام کیا۔ مشقوں میں ٹینک، انفینٹری، ہیلی کاپٹرز، جہاز، آرٹلری اور دیگر شامل تھے۔ جرمن افواج نے انتہائی عمدہ طریقے سے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جنہیں تمام مشاہدین نے سراہا۔ مشقوں کے اختتام پر جرمن کمانڈر نے رحیم الدین کی رائے جاننا چاہی۔ انہوں نے تعریف کی بجائے طنزیہ انداز میں کہا کہ مشقیں بہت اچھی رہیں کیوں کہ ان میں شامل جوانوں نے تماشائیوں کے سامنے ایک ہی شو بار بار پیش کرنے کے لیے خاصی محنت کی۔ جرمن جرنیل اس جواب سے ناخوش ہوتے ہوئے بولے کہ ایسی بات نہیں۔ مشق میں شریک سپاہیوں میں سے کسی ایک نے بھی ادارے میں تین ماہ سے زائد تربیت نہیں لی۔ ان میں سے زیادہ تر بالکل نئے تھے۔

دوسری غلطی تب ہوئی جب جنرل رحیم الدین نے میری رہائش گاہ پر ڈنر کے دوران زیادہ تر جرمن جرنیلوں کو صحت مند دیکھتے ہوئے جملہ کسا کہ مجھے موٹے فوجی پسند نہیں۔ جرمن جرنیلوں نے اس بات کا برا مناتے ہوئے ان سے ناراضی کا اظہار کیا۔

23 دسمبر 1986ء کو مجھے پی آئی اے ہیڈ آفس کراچی سے بذریعہ ٹیلی گرام مطلع کیا گیا کہ پاکستانی پاسپورٹ کے حامل افراد کو پی آئی اے سے منزل تک پہنچنے کے دوران جرمنی میں وقتی قیام کے لیے بھی ویزہ درکار ہوگا۔ اس پابندی کی وجہ وہ افغان شہری بنے جو پاکستان کے پاسپورٹ پر سفر کرتے اور جرمنی پہنچتے ہی سیاسی پناہ مانگ لیتے۔ چوں کہ جرمن قانون اس کی اجازت دیتا تھا، اس لیے جرمن حکام انہیں واپس

نہیں بھیج سکتے تھے اور چار و ناچار پناہ دینا پڑتی۔ اس قانون کے اطلاق سے پی آئی اے کے لیے فرینکفرٹ کے ذریعے مختلف منازل تک پہنچنا ممکن نہ رہتا کیوں کہ وہ لوگ ان پروازوں میں سفر کرنے لگتے جنہیں جرمنی میں ویزہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھ سے اس قانون کو معطل یا منسوخ کرانے میں مدد کے لیے کہا گیا۔

میں نے سب سے پہلے LUFTHANZA کے صدر سے رابطہ کیا۔ تمام صورتِ حال ان کے گوش گزار کرتے ہوئے میں نے واضح کیا کہ اگر پی آئی اے فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر نہیں اتر سکے گی تو LUFTHANZA بھی کراچی ایئرپورٹ استعمال نہیں کر سکے گی۔ پاکستان اور جرمنی میں بہتر تعلقات تھے اور دونوں ممالک کی ایئر لائنز کی ایک دوسرے پر پابندی سے صورتِ حال بگڑ سکتی تھی۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے ہمیں ہر قسم کے اقدامات کی ضرورت تھی۔ لفتھینزا کے صدر نے کہا کہ کرسمس کی چھٹیوں کے بعد نیا سال شروع ہوتے ہی اس صورتِ حال سے نمٹا جائے گا۔ میں نے کہا کہ تب تک بہت دیر ہو جائے گی کیوں کہ اس عرصہ میں دونوں ممالک کی پروازیں معطل رہیں گی۔ وہ کشیدہ صورتِ حال سے بچنے کے لیے فوری اقدامات پر رضامند ہو گئے۔

میں تب جرمن وزیر خارجہ گینشر سمیت دیگر وزراء سے ملا جنہوں نے مسئلہ حل کرنے کا وعدہ کیا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس صورتِ حال سے وابستہ زیادہ تر جرمن کرسمس اور نئے سال کی چھٹیوں پر تھے۔

دفتر خارجہ میں سٹیٹ سیکریٹری جرگن روفس (GURGEN RUFHAS) جب وزارتِ داخلہ سے یہ فیصلہ منسوخ کرانے میں ناکام ہوئے تو مجھ سے کہا کہ یہ مسئلہ جرمن افسران کی چھٹیوں سے واپسی کے بعد ہی حل ہو سکے گا۔ میں نے ان سے بھی پی آئی اے پر پابندی کے بدلے میں LUFTHANZA کے کراچی داخلہ پر پابندی کا ذکر کیا۔ جرگن کو یقین نہ آیا کہ واقعی ایسا ہو سکتا تھا جس پر میں نے کہا کہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

میں نے سیکریٹری خارجہ عبدالستار سے بات کی جس میں ہم نے اتفاق کیا کہ پاکستان پریس ریلیز جاری کرے جس میں جرمن افراد کے مختلف ممالک پرواز کے

دوران پاکستان میں عارضی قیام کے لیے بھی ویزہ پابندی کا اعلان کیا گیا۔ جرمن حکام اس اعلان پر چونک گئے اور متعلقہ افسران کی چھٹیاں منسوخ کرتے ہوئے انہیں واپس بلایا گیا۔ صرف ایک دن میں جرمن حکام نے یہ قانون معطل کر دیا۔

یونیسکو (UNESCO) انتخاب

1987ء میں پیرس میں یونیسکو انتخابات میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ کے لیے صاحبزادہ یعقوب علی خان پاکستان سے امیدوار تھے۔ اس وقت ڈائریکٹر جنرل ایم بوء (M.Bow) کا تعلق سینیگال سے تھا۔ وہ گزشتہ دو ادوار میں یونیسکو کے ڈی جی رہ چکے تھے۔ یونیسکو کے متعدد ممبران ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ وہ تیسرے دَور کے لیے نامزد ہوئے۔ یورپی ممالک خصوصاً امریکہ، برطانیہ اور جرمنی ان کے سخت مخالف تھے۔ برطانیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر بوء دوبارہ منتخب ہوئے تو وہ یونیسکو چھوڑ دے گا۔

وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان عمدہ شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ مختلف یورپی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ وہ مختلف ممالک میں سفیر اور پاکستان کے وزیر خارجہ بھی رہے۔ تاہم ان کے پاس گریجویشن کی ڈگری نہ تھی۔ اس کمی کو یہ کہہ کر پورا کیا گیا کہ وہ آرمی افسر تھے اور جن دنوں فوج میں بھرتی ہوئے تو ادارے میں داخلے کے لیے گریجویشن کی شرط نہ تھی۔ موجودہ دَور کے برعکس ملٹری اکیڈمیاں افسران کو ڈگری بھی نہیں دیتی تھیں۔ یورپی ممالک خصوصاً جرمنی صاحبزادہ کے حق میں تھے۔ روس بھی یونیسکو کو تباہ ہوتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ روس کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ سوشلسٹ ملک بلغاریہ نے بھی اپنا امیدوار میدان میں اتارا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ بلغاریہ نہیں جیتے گا، روسیوں نے جرمن حکام کو بتایا کہ وہ تیسرے بیلیٹ میں صاحبزادہ کا ساتھ دیں گے۔ اگرچہ پہلے دو بیلیٹس میں موجودہ ڈی جی نے زیادہ ووٹ حاصل کیے، تاہم نتائج بے نتیجہ تھے۔ ان کی پوزیشن مستحکم تھی مگر پیرس میں نیاز نائیک اور عطیہ عنائت اللہ پر مشتمل ٹیم کے غلط مشورہ پر انہوں نے اپنا نام واپس لے لیا۔ پیرس میں ہماری ٹیم کا اندازہ غلط تھا

کیوں کہ پہلے دونوں مراحل میں اٹلی اور جرمنی نے صاحبزادہ کو ووٹ نہیں دیا۔ حقیقت میں افریقہ کے دو عرب ممالک نے صاحبزادہ کو ووٹ نہیں دیا تھا۔ پہلے دونوں بیلٹ میں اٹلی اور جرمنی نے صاحبزادہ کو ووٹ دیئے۔ جب جرمن دفتر خارجہ کو یہ اطلاع ملی کہ صاحبزادہ نے اپنی نامزدگی کو واپس لے لیا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔ مجھے بتایا گیا کہ وائس چانسلر اور وزیر خارجہ گینشر، لاطینی امریکہ و دیگر ممالک کے سربراہان کو رات بھر فون کر کے پاکستان کو ووٹ دینے کا کہتے رہے۔ وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ انہیں صاحبزادہ کے نامزدگی واپس لینے پر مایوسی ہوئی۔ بو، تیسرے بیلیٹ کے بعد ہار گئے۔ ان کے مقابلہ میں واحد شخص جس نے نامزدگی واپس نہ لی، ہسپانوی تھا جو نیا ڈائریکٹر جنرل یونیسکو منتخب ہو گیا۔

انتخابات اور صاحبزادہ کے مقابلے سے قبل از وقت باہر ہونے کے عرصے کے دوران صدر ضیاالحق، ترکی تھے۔ چوں کہ جونیجو چیف ایگزیکٹو تھے، لہٰذا ضیاالحق کو اس واقعہ کا قطعاً علم نہ ہوا۔ صاحبزادہ نے بھی اپنے فیصلہ سے ضیاالحق کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ میں نے ضیاالحق کو بتایا کہ پاکستان نے موقع گنوا دیا ورنہ صاحبزادہ ڈی جی بن جاتے۔ ضیاالحق بھی مایوس ہوئے اور کہا کہ بعض لوگ صرف اس وقت تک اچھی کارکردگی دیتے ہیں جب تک انہیں تھپکی ملتی رہے۔ صاحبزادہ اس وقت تک اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے رہے جب تک ان کے پیچھے ضیاالحق کا ہاتھ تھا۔ درحقیقت چیف ایگزیکٹو جونیجو بھی صاحبزادہ کو پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا انہیں کہیں سے مدد نہ ملی۔

جرمن ایوارڈ

جرمن حکومت نے دونوں ممالک میں تعلقات کے فروغ کے لیے میری خدمات کو سراہتے ہوئے مجھے سب سے بڑا قومی اعزاز دینے کا فیصلہ کیا۔ حکومت پاکستان نے اس کی اجازت دینے میں دیر کر دی جس کے باعث مجھے ایوارڈ جرمنی میں دورانِ قیام نہ ملا۔ بعد ازاں دسمبر 1987ء کو جرمن سفیر ہیمر شڈ ونگ

(BEHRENDONG) نے اسلام آباد میں اپنی رہائش گاہ پر عشائیہ کے دوران مجھے یہ اعزاز دیا۔صدر ضیا نے بھی تقریب میں شرکت کی۔

جرمن چانسلر کوہل کا دورہ پاکستان

جرمن چانسلر کوہل 1984ء میں بھارت کے بعد پاکستان آئے ۔ وہ صنعت کاروں اور کاروباری افراد کے ہمراہ مختلف ممالک کے دورہ پر تھے۔صدر ضیاالحق سے خصوصی ملاقات کے دوران اہم امور اور پاکستان سے تعاون میں اضافہ پر بات ہوئی۔ میں اٹلی میں سفیر تھا مگر اس وقت جرمنی میں تبادلہ کا حکم نامہ جاری ہو چکا تھا۔ جرمنی سے معاہدہ کے بعد اس کا اعلان ہوا۔کوہل نے ضیاالحق کو دورہ بھارت بارے بھی بتایا۔ انہوں نے بتایا کہ سونیا گاندھی سے ملاقات کے دوران بھارتی رہنما کا کہنا تھا کہ وہ اپنے خاندان پر قاتلانہ حملوں کے حوالے سے شدید پریشان ہیں۔جب بھی ان کے بچے سکول جاتے،وہ بے چین ہو جاتیں۔

جرمن صدر ڈاکٹر ویسکر (WEISACKER) نے میرے اعزاز میں الوداعی عشائیہ کے دوران بتایا کہ کوہل،ضیاالحق سے بہت متاثر اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ کوہل دوسروں کی تعریف کے معاملہ میں کافی بخیل ہیں۔ جرمن وائس چانسلر اور وزیر خارجہ گینشر پرُ مزاح شخصیت اور ذوق وشوق سے میلوں میں حصہ لیتے۔ میں گیارہ سال جرمنی رہا اور اس دوران متعدد تقریبات پر ان سے ملاقات ہوئی۔ گینشر ہمیشہ یہ تاثر دیتے کہ انہیں زیادہ انگریزی نہیں آتی۔ایک بار میں نے صدر ضیاالحق سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ گینشر روانی سے انگریزی بولتے ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ جب بھی گینشر سے ملاقات ہو تو انہیں یہ بات بتاؤں۔ایک روز کسی تقریب میں ملاقات کے دوران میں نے انہیں ضیاالحق کی انگریزی کے حوالے سے بات بتائی۔گینشر نے کہا کہ تمہارے صدر جھوٹ نہیں بولتے، میں انگریزی زبان بولنے کی صلاحیت کو راز میں رکھتا ہوں۔

1986ء میں بھارت سے کشیدگی

دسمبر 1986ء میں پاکستان اور بھارت میں کشیدگی اس حد تک بڑھ گئی کہ خطرہ پیدا ہو گیا مبادا دونوں ممالک جنگ کے دہانے پر پہنچ جائیں۔ میں پاکستان سے جرمنی واپسی کے روز ضیاالحق کے ساتھ گالف کھیلا۔ گالف کھیلنے کے بعد انہوں نے مجھے چائے کے لیے رکنے کا کہا۔ وہ اس قدر تحمل مزاجی اور اطمینان سے پیش آ رہے تھے کہ ان کے چہرے سے پاک بھارت کشیدگی کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ان کا خدا اور مذہب پر اتنا اعتقاد تھا کہ وہ خدا کو ہی حامی و ناصر ٹھہراتے۔ سفارتکار حیران رہ گئے کہ پاکستان جنگ کے دہانے پر ہے اور صدر گالف کھیلنے میں مصروف تھا۔

راجیو کی استقبال کے لیے ہچکچاہٹ کے باوجود ضیاالحق دہلی میں کرکٹ میچ دیکھنے گئے۔ اس دورہ نے بھارت کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ اپنی والدہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد راجیو بلٹ پروف جیکٹ پہنتا تھا۔ ضیاالحق نے طیارے سے اترتے ہی راجیو سے گلے ملنا چاہا مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ تب ضیاالحق نے راجیو کے کندھوں کے گرد ہاتھ رکھے تو اندازہ ہوا کہ اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی اور اسی لیے گلے ملنے سے ہچکچا رہا تھا۔ ضیا نے اس دوران راجیو کو تنبیہ کی کہ وہ پاکستان پر حملہ سے باز رہے ورنہ بھارت کو سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ اس کے بعد بھارت حملے سے باز رہا۔ آرمرڈ کور کے کمانڈر میجر جنرل روشن نے ضیاالحق کی وفات کے بعد مجھے بتایا کہ سابق صدر نے اس جارحانہ انداز سے آرمرڈ کور کو میدان میں لگایا ہوا تھا کہ اس سے بھارت خائف ہو گیا۔

ضیاالحق کے احکامات پر میرا پاکستان میں قیام مختصر ہو گیا کیوں کہ ایک آرمی میجر جو کسی پُراسرار بیماری کے باعث فرینکفرٹ یونیورسٹی کلینک میں زیرِ علاج تھا اسے پاکستان میں علاج کی سہولت نہ ہونے پر بلا اجازت جرمنی لایا گیا تھا۔ فوجی طبی حکام کا اصرار تھا کہ میجر کا علاج پاکستان میں کیا جائے، تاہم ملٹری ہسپتالوں میں آپریشن کے بعد کوئی بھی زندہ نہیں بچتا تھا۔ ضیاالحق نے حکم دیا کہ میں سیدھا کلینک جاؤں، حقیقت کو

پرکھوں اور انہیں حقیقت سے آگاہ کروں۔

فرینکفرٹ ایئرپورٹ سے سیدھا یونیورسٹی کلینک پہنچا جہاں علم ہوا کہ فیملی کا بیان بالکل درست تھا۔ میں نے ضیاالحق کو اطلاع کر دی۔ انہوں نے انتظامیہ کو حکم دیا کہ مریض کا سرکاری خرچ پر علاج اور بعدازاں پاکستان واپسی کے انتظامات بھی خود کیے جائیں۔

پاکستان کے ویزہ ضوابط موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھے۔ اس وجہ سے اقتصادی اہمیت کے ممالک سے پاکستان کے معاشی تعلقات میں رکاوٹیں آرہی تھیں۔ جرمنی میں سفیر کی حیثیت سے مجھے احساس ہوا کہ جرمن صنعت کاروں کے لیے تین ماہ کی ویزہ معیاد غیر مناسب تھی۔ میں نے ہدایات جاری کیں کہ جرمن کاروباری طبقہ اور صنعت کاروں کو تین برسوں کے لیے ملٹی پل انٹری ویزہ جاری کیا جائے۔ اس سہولت سے جرمنی کا پاکستان میں کاروباری رجحان بڑھا اور کاروباری نقل وحمل میں بھی اضافہ ہوا۔ حکومت پاکستان نے میرے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے اس حوالے سے ہدایات جاری کیں۔

جرمنی میں مجھے کمرشل کونسلر یونس خان کی خدمات حاصل تھیں جو بعدازاں آڈیٹر جنرل آف پاکستان بنے۔ یونس خان کی تندہی اور محنت کے باعث پاکستان، جرمنی میں بڑی حد تک برآمدات بڑھانے میں کامیاب ہوا۔ پاکستان کی برآمدات میں اضافے کی غرض سے میں نے انہیں تمام مقامات اور شخصیات سے ملاقات کی مکمل اجازت دے رکھی تھی۔ میں نے انہیں دونوں ممالک کے مشترکہ کاروبار اور جرمنی کی پاکستان میں سرمایہ کاری کے لیے اقدامات کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ 1984ء سے 1987ء کے دوران پاک جرمن اقتصادی تعلقات میں ہر سطح پر خوب ترقی ہوئی۔

میں ہمیشہ انفرادی کوشش پر ٹیم ورک کو فوقیت دیتا۔ دفتری اجلاس کے دوران اہم معاملات پر گفتگو ہوتی اور باہمی رائے کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جاتی۔ جرمنی وہ ملک ہے جہاں اقتصادی و دیگر سرگرمیاں ایک مرکز سے منسلک نہیں۔ تمام

ریاستیں متوازی طور پر ترقی یافتہ ہیں۔ تمام وفاقی ریاستوں میں صنعتیں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی وامریکی فضائیہ کی بمباری ڈرسڈن، کلون، ہیمبرگ، برلن اور میونخ جیسے شہروں کی تباہی کے باوجود اسی ریاستی خودمختاری کے باعث جرمنی تیزی سے دوبارہ اقتصادی ترقی میں عروج پر پہنچا۔

جرمن صنعت کو کم نقصان ہوا اور ہنرمند بھی محفوظ رہے۔ اس وسیع انفراسٹرکچر کی موجودگی نے جرمنی کو فوراً اقتصادی ترقی پر گامزن کر دیا۔

پاکستان کے لیے ہر سطح پر فائدہ تلاش کرنے کی غرض سے بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا۔ لہٰذا میں نے تمام ڈیپارٹمنٹس کے سربراہان اور دیگر افسران کو بجٹ میں رہتے ہوئے اہم مقامات پر زیادہ سے زیادہ رسائی کی ہدایات دیں۔ اس کے شاندار نتائج برآمد ہوئے اور پاکستان سے جرمنی برآمدات میں 30 فیصد سالانہ اضافہ ہوا۔ اسی طرح سرمایہ کاری، سیاحت اور دونوں ممالک میں ایک دوسرے کی اہم شخصیات کے دورے بھی بڑھے۔

میں نے تمام جونیئر افسران کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی غرض سے خود فیصلے لینے کا اختیار دیا ہوا تھا۔ اسی لیے مجھے بہتر نتائج حاصل کرنے میں خوب مدد ملی جو شاید انفرادی کوششوں سے ممکن نہ ہوتی۔ ان کا حصہ اور تعاون بھی میری عزت میں اضافہ کرتا۔

بویریا کے منسٹر پریزیڈیٹ اور کرسچن سوشلسٹ یونین کے چیئرمین سٹراس پاکستان کے دوستوں میں شمار ہوتے۔ سیمنز اور دیگر بڑی کمپنیوں کے ہیڈکوارٹرز میونخ اور بویریا کے دیگر علاقوں میں موجود تھے۔ پاکستان کے لیے حساس سامان اور دیگر ملکی مفادات کے حصول کی خاطر اکثر و بیشتر سٹراس کی مدد درکار ہوتی۔ 1985ء میں میونخ میں فیشنگ میلہ کے دوران میں نے تمام شام سٹراس اور ان کی فیملی کے ساتھ گزاری۔ چوں کہ وہ بویرئین بیئر پینے میں مصروف تھے لہٰذا کافی دیر ہو گئی۔ قریباً رات 2 بجے سٹراس کی اہلیہ نے ان سے کہا کہ پہلے وحید کی بات سنو اور پھر لطف اندوز ہونے واپس جانا۔

سٹراس اوران کے ساتھی اکثر کہتے تھے کہ پاکستان کو ایٹمی بم جلد از جلد بنالینا چاہیے۔

ایڈمرل کے کے خان کا دورہ جرمنی

پاک بحریہ کے سربراہ ایڈمرل کے کے خان جرمن ہم منصب کی دعوت پر جرمنی آئے۔ بعدازاں جرمن بحریہ کے سربراہ تمام افواج کے انسپکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس حیثیت سے چیف آف جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کی دعوت پر پاکستان کا دورہ بھی کیا جس دوران وہ پاکستان سے خوب متاثر ہوئے۔ انہوں نے پاکستان میں جن دعوتوں میں بھی شرکت کی وہاں میری اور میری اہلیہ کی شرکت کو یقینی بنایا۔

ایڈمرل کے کے خان برطانیہ میں تربیت کے باعث انگلینڈ کے حامی تھے۔ ان دنوں پاکستان FRIGATES خریدنے کے لیے کوشاں تھا۔ برطانیہ نے ٹی 23 بحری FRIGATES کی تکمیل کے مرحلہ سے گزرنے کے باعث ٹی 21 FRIGATES کی تیاری روک رکھی تھی۔ جرمن بھی بیڑے تیار کر رہے تھے جنہیں وہ برطانوی FRIGATES سے بہتر قرار دیتے۔

جرمن حکومت بالخصوص وزارت اقتصادی معاملات کی کوشش تھی کہ پاکستان جرمن FRIGATES خریدے۔ چانسلر کوہل کا دفتر بھی اس کوشش میں مصروف تھا اور پاکستان کو برآمدی قرض کی بھی پیشکش کی گئی۔ ایڈمرل خان کو جرمن بحریہ کی حساس تنصیبات بشمول سمندر شالی پر واقع ہیڈکوارٹرز کا دورہ بھی کرایا گیا۔ جرمن تنصیبات دیکھنے کے بعد ایڈمرل خان نے مجھے بتایا کہ دورۂ برطانیہ کے دوران انہیں انتہائی حساس اور خفیہ مقامات نہیں دکھائے گئے تھے۔ اس کے برعکس جرمن بحریہ نے انہیں قریباً تمام مقامات دکھائے۔

سپیکر پنجاب اسمبلی منظور احمد وٹو نے جرمن صوبائی سپیکر اسمبلی کی دعوت پر جرمنی کا دورہ کیا۔ ان کا انتہائی شاندار استقبال کیا گیا۔ وہ 1993ء میں پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر وزیراعلیٰ پنجاب بنے تھے۔ مسلم لیگ ن کے ممبران قومی اسمبلی کو ان سے دور رہنے کی

ہدایت تھی۔ایک روز بذریعہ پرواز اسلام آباد سے لاہور واپسی پر وٹو نے مجھ سے کہا کہ وہ ترقیاتی مقاصد کے لیے میری مدد کر سکتے ہیں۔میری ہچکچاہٹ کا ادراک کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں چیف سیکریٹری پنجاب جاوید قریشی سے رابطہ کر سکتا ہوں جو میرے قریبی دوست بھی تھے۔جاوید قریشی کے دفتر سے بھی مجھے خاصی مدد ملی۔ریلوے سٹیشن سے شالیمار باغ تک سڑک کا فاصلہ 20 کلومیٹر تھا جسے ان کے خصوصی تعاون سے دوبارہ تعمیر کروایا گیا۔

جرمن محنتی لوگ ہیں۔دوسری جنگ عظیم سے تباہی کے بعد جرمن صنعت اور سڑکوں کی تعمیر 24 گھنٹے جاری رہتی۔جرمن افراد اپنی انتظامی صلاحیتوں پر نازاں ہیں۔وہ محب وطن ہیں۔جرمن قومی ترانہ میں ''جرمنی ہر شے سے بالاتر ہے'' کا مصرعہ بھی آتا ہے۔اس کا مطلب نہ صرف یہ ہے کہ جرمن عوام کے لیے ان کا ملک سب سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ بھی کہ جرمنی دنیا میں بھی سرفہرست ہے۔جرمنی کی بنی ہوئی مصنوعات دنیا بھر میں بہترین تصور کی جاتی ہیں۔جرمن فطری طور پر خودسر ہیں۔وہ خوش لباس، خوش خوراک اور صفائی پسند ہیں۔اگرچہ جرمن کھانے چند بنیادی اجزاء تک محدود ہیں تاہم کئی برسوں کے دوران خوش حالی اور بین الاقوامی سفر کے باعث دنیا بھر کے کھانے یہاں دستیاب ہوتے ہیں۔اقتصادی خوش حالی کے باعث وہ اپنے معاشی معجزوں پر فخر کرتے ہیں۔جرمن خواتین بھی اپنی خوبصورتی و جسمانی وضع قطع کا خاص خیال رکھتی ہیں۔اسی وجہ سے آلو کی جگہ ایسی اشیائے خورد و نوش کا رواج بڑھا ہے جن میں نشاستہ کم ہو۔جرمن اپنے گھروں کو بھی بہترین حالت میں رکھتے ہیں جو نہ صرف اندر بلکہ باہر سے بھی رنگ ہوتے ہیں۔وہ پھولوں اور باغبانی کے شوقین ہیں۔یورپ میں کہیں بھی پھولوں اور پودوں سے سجا گھر نظر آئے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کا مالک کوئی جرمن ہوگا۔کسی جرمن کا بہترین دوست بننے کے لیے اس کے معیار پر پورا اترنا بہت ضروری ہے۔جس سے مراد خوش لباس ہونا، اچھی رہائش، بہترین خوراک اور خوراک کے لیے استعمال ہونے والے برتنوں کا عمدہ ہونا لازمی ہے۔جرمن اپنی گاڑیوں کو بھی اندر اور باہر سے بہت

صاف رکھتے ہیں۔ازراہِ مزاح کہاجاتا ہے کہ جرمن اپنی گرل فرینڈ سے زیادہ کار کا خیال رکھتے ہیں۔ ایک بار انہیں اندازہ ہو جائے کہ سفارتکار ان کی سطح پر پہنچ گیا ہے تو وہ دوست بن جاتے ہیں۔ جرمن عموماً مہمانوں کو ریستوران میں دعوت دیتے ہیں، تاہم گہری دوستی ہو جائے تو گھر مدعو کر کے خوب خاطر تواضع کرتے ہیں۔کھانا گھر ہی تیار کیا جاتا ہے۔ مجھے سٹیٹ سیکریٹری ڈاکٹر میسٔر لینڈرت نے متعدد بار اپنے ہاں دعوت دی اور بہترین کھانے سے تواضع کرتے۔ جرمن صدر ڈاکٹر ویسیکر اور ان کی اہلیہ نے مجھے الوداعی عشائیہ میں بتایا کہ مسز ویسیکر بہترین کھانے تیار کر سکتی ہیں۔معمولی تنخواہ اور مراعات کے باوجود پاکستانی سفارتکار جرمن افسروں کے معیار پر پورا اترتے اور ان سے دوستی کرتے ہوئے بہترین نتائج کے حصول میں کامیاب ہوتے۔

پروفیسر شمیل

بون یونیورسٹی کی ڈاکٹر این میری شمیل اس دَور کی عظیم شخصیت تصور کی جاتی تھیں۔ انہیں بہت سی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کا فلسفہ اقبال پر عبور اور تمام پاکستانی، ایرانی اور ترک صوفی شعراء کا مطالعہ تھا۔وہ پاکستان کی بہترین دوست اور پاکستان پر منعقد تمام تقاریب میں بڑھ چڑھ کر شرکت کرتیں۔ پاکستان کا تاثر بہتر بنانے میں بھی ان کا خوب کردار تھا۔

پاکستان کے 40 سال

میں نے 1987ء میں پاکستان کی چالیسویں سالگرہ پر جرمنی بھر میں متعدد پروگرام بشمول گالف ٹورنامنٹس، سیمینار، نمائش اور ثقافتی نمائشیں منعقد کرائیں۔ موہنجوداڑو اور گندھارا تہذیب پر آچن، میونخ اور برلن کی یونیورسٹیوں میں نمائشوں کا انعقاد ہوا۔میری اہلیہ نے ڈسلڈورف کے اوپرا میں پاکستان ثقافتی شو کرایا جس پر حاضرین نے نشستوں سے کھڑے ہو کر داد دی۔

گالف ٹورنامنٹ

میں نے بون گالف کلب میں ٹورنامنٹ کرایا جس میں جرمنوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ ایک گالفر کی گیند ریت کے بنکر میں گر گئی اور متعدد کوششوں کے باوجود نکالی نہ جا سکی۔ یہ دیکھتے ہوئے ایک جرمن تماشائی نے شستہ انداز میں کہا کہ دوست دل چھوٹا نہ کرو، ہٹلر کی موت بھی بنکر میں ہی ہوئی تھی۔

پاکستان ایٹمی طاقت کیسے بنا

پاکستان سیاسی طوفان اور قیامت جس کو ہندوستان کی تقسیم کہتے ہیں، میں معرضِ وجود میں آیا، بے بہا خون بہا اور مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ بھارت کا کشمیر پر قبضہ اور اثاثہ جات پاکستان کو منتقل کرنے سے انکار، یہ واضح کر چکا تھا کہ دونوں ممالک پُر امن ہمسائے بن کر نہیں رہیں گے۔ بھارتی خارجہ پالیسی کی حکمت عملی کہ بڑی مچھلی چھوٹی کو کھاتی ہے، پاکستان کے لیے خطرناک تھی۔ اسی ہندووانہ سوچ کے تحت کشمیر، جونا گڑھ، مناودر، حیدر آباد، گوا اور بہت سی دیگر ریاستوں پر قبضہ کر لیا گیا جس نے پاکستان پر واضح کر دیا کہ بھارتی تسلط سے نجات کے لیے اسے اپنا دفاع مضبوط بنانا ہوگا۔ 1965ء کی جنگ اور 1971ء میں مشرقی پاکستان میں بھارتی دراندازی نے پاکستان کو اپنی سلامتی اور خود مختاری کے لیے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اپنا دفاع مضبوط بنانے پر مجبور کر دیا۔ بھارت نے ان تمام قوانین کی خلاف ورزی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جو ریاستوں کے تعلقات کے ضامن ہیں۔ ہندوستان نے ان کو بری طرح پامال کیا۔ قریباً 93 ہزار پاکستانی (سپاہی، عام شہری، عورتیں اور بچے) سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد تین سال تک بھارتی جیلوں میں کٹھن وقت گزارتے رہے۔ ان قیدیوں کے ساتھ جنیوا کنونشن 1949ء جس کی رُو سے

جنگ بندی کے فوراً بعد قیدیوں کو ان کے ملک میں لوٹا دیا جاتا ہے، کی خلاف ورزی کی۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور کچھ کی تو ہلاکتیں بھی واقع ہوئیں۔

چوں کہ بھارت بالائی سطح پر ہونے کی وجہ سے دریاؤں کو کنٹرول رکھتا ہے، اس لیے اب مسلسل پاکستان کا پانی روکتے ہوئے سندھ طاس معاہدہ کی خلاف ورزی کررہا ہے۔ دریائی پانی کا رخ موڑ کران پر ڈیم، بیراج اور پن بجلی بنارہا ہے۔

18 مئی 1974ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا اور جس کو اس نے پُرامن کہا۔ ایٹمی دھماکہ کا مطلب ایٹمی طاقت بن جانا ہے۔ اس کے نتیجے میں بھارت نے عام جنگی اور ایٹمی ہتھیاروں میں سبقت حاصل کرلی۔ پاکستان کو بھی بھارتی بالادستی سے بچنے کے لیے ہتھیاروں کی دوڑ میں شامل ہونا پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی نیوکلیئر طاقت بن جائے۔

1975ء میں بھٹو نے فرانس سے نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ خریدنے کا معاہدہ کیا۔ امریکی دباؤ کے باعث فرانس اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا اور پاکستان کو وہ رقم بھی نہ ملی جو پیشگی دی گئی تھی۔

صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں کینیڈا کی مدد سے کراچی میں کینوپ (ایٹمی طاقتی ری ایکٹر) قائم کیا گیا۔ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن نے بھی نیلور میں امریکہ کی مدد سے ایک چھوٹا تجرباتی ری ایکٹر قائم کیا جس کا مقصد ایٹمی توانائی کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایوب خان کے پرنسپل سیکریٹری فدا حسین پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کے مخالف تھے۔ تاہم ایوب خان کی خواہش تھی کہ ایسا ممکن ہو۔

1964-65ء میں اس وقت کے چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن آئی ایچ عثمانی، روئیداد خان اور ایک افسر بون آئے اور ایٹمی توانائی سے وابستہ متعدد افراد سے ملے۔ ایک شام میں نے انہیں اپنی رہائش گاہ پر کھانے کی دعوت دی جہاں انہوں نے رات گئے تک قیام کیا۔ ہم کیسٹ پلیئر پر پاکستانی گیت سنتے رہے۔ قریباً صبح چار بجے ''میرے یار شب بخیر'' لگا۔ گانا چلتے ہی مہمانوں کو احساس ہوا کہ انہیں رخصت لینی چاہیے۔

ایک خط جس نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنایا

ستمبر 1974ء کے تیسرے ہفتے میں ڈائریکٹر مغربی یورپ کی حیثیت سے مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا خط موصول ہوا جو ان دنوں ہالینڈ مقیم تھے۔ خط میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے لیے خدمات پیش کی تھیں۔

انہوں نے ہیگ میں ہمارے سفیر جے جی فراس (پارسی اور محبِ وطن پاکستانی) کے ذریعے یہ خط مجھ تک پہنچایا تھا۔ عموماً اس طرح کے خطوط فائلوں کی نذر ہوجاتے تھے۔ کچھ خطوط میں لکھنے والے یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس بنا بنایا ایٹم بم یا کوئی انتہائی تباہ کن ہتھیار موجود ہے۔ خوش قسمتی سے میری اپنے افسر مطاہر حسین سے قریبی دوستی ہوچکی تھی جس کے باعث وہ مجھے فیصلہ لینے کا اختیار دے چکے تھے۔ میری سوچ نے مجھے اس بات پر فوری آمادہ کردیا کہ یہ خط وزیراعظم بھٹو کو بھیجنا چاہیے۔ وہ مان گئے۔ سیکریٹری خارجہ کو سمری اور وزیراعظم کو وہ خط بھیج دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ڈاکٹر خان کی خدمات حاصل کی گئیں اور پاکستان ایٹمی طاقت بن گیا۔ ایٹمی پروگرام کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو نے کیا۔ چوں کہ امریکہ اس کے خلاف تھا لہٰذا امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے دھمکی دی کہ پاکستان کو تباہ کردیں۔ بھٹو نے کہا کہ ہم گھاس کھائیں گے مگر ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔

پاکستان کے ایٹمی بم کا معمار ۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ویسٹ برلن کی ٹیکنیکل یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1967ء میں ٹیکنیکل یونیورسٹی ڈیلف، ہالینڈ سے میٹالرجیکل انجینئرنگ میں ایم ایس کیا۔ پانچ سال بعد انہوں نے لیوین کی کیتھولک یونیورسٹی، بلجیئم سے میٹالرجیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی مکمل کی۔

یہ الزام کہ ڈاکٹر خان سینٹری فیوجز کی ڈرائنگ اور مشینیں پاکستان لائے تھے، بے بنیاد ہے کیوں کہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ دسمبر 1975ء میں چھٹیاں گزارنے

اپنے ملک آئے تھے۔ ان کے ساتھ کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے تمام کاغذات ہالینڈ میں تھے۔ انہوں نے جو بھی کیا، اپنی یادداشت کے بَل بوتے پر کیا۔ ڈاکٹر خان نے یورپ میں 15 سال قیام کے دوران یورپی نیوکلیئر صنعت کا گہرا مطالعہ کیا۔ انہوں نے مقاصد کے حصول کے لیے نیوکلیئر معاملات سے وابستہ اعلیٰ اہلکاروں اور عہدیداران سے دوستی کر لی۔ چند برسوں میں ہی وہ ایٹم بم کے لیے درکار تمام مواد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے یورپ میں طویل عرصہ قیام اور متعدد ممالک اور صنعتوں میں حاصل کردہ علوم سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دو برسوں میں ایٹم بم بنانے کے لیے انہوں نے سینٹری فیوجز کے پروٹو ٹائپس چالو کر دیئے جو کہوٹہ میں پوری رفتار کے ساتھ کام کرنے لگے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنے یورپ میں قیام اور دوسرے ملکوں کی صنعتوں کے متعلق معلومات کا استعمال کیا جو پاکستان میں ایٹم بم بنانے کے لیے ایک بہت بڑا اثاثہ تھیں۔

ہالینڈ کے سابق وزیراعظم لوبرز کا خیال تھا کہ امریکیوں کی جانب سے ڈاکٹر خان کا تعاون ایک طویل مگر احمقانہ منصوبہ بندی کا حصہ تھا۔ امریکیوں کو علم تھا کہ پاکستان ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے تاہم اس بنیاد پر مطمئن رہے کہ یہ ان کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتے۔ یہ ہتھیار بھارت اور ممکنہ طور پر سوویت کو پاکستان کے خلاف ایٹم بم استعمال کرنے سے روکنے کے لیے بنایا جا رہا تھا۔

منیر احمد خان بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی، ویانا میں جونیئر P5 افسر تھا اور بعدازاں پاکستانی ایٹمی توانائی کمیشن کا چیئرمین رہا۔ وہ ایمبیسیڈر انور مراد کا خاص آدمی تھا اور اس کے ساتھ مل کر ہی سفارتخانہ کے افسران کو زچ کرتا۔ بھٹو اسے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا چیئرمین بنا کر پاکستان لائے تھے۔ بھٹو کے اقتدار کھوتے ہی اسے بھی ہٹا دیا گیا مگر صدر ضیاالحق نے میری درخواست پر اس کا عہدہ بحال کیا۔ منیر احمد خاں کا ایک دوست میاں خالد جرمنی میں مقیم تھا اور کچھ عرصہ تک سفارتخانے میں انسپکشن ڈویژن میں کام کرتا تھا۔ وہ منیر احمد کا ہم جماعت تھا اور میرے ساتھ گالف کھیلا کرتا تھا۔ اس نے

مجھے کہا کہ میں ضیاالحق سے درخواست کروں کہ منیر احمد کو دوبارہ کام پر لگا لیا جائے۔ اگرچہ میں منیر احمد کی ویانا میں حرکات سے نالاں تھا، مگر میں نے خالد کی سفارش مانتے ہوئے ضیا سے سفارش کی کہ اسے عہدہ پر دوبارہ فائز کیا جائے۔ صدر ضیا نے میری بات مان لی اور اسی وقت منیر احمد کو فون کر کے بلایا۔ جرمنی میں وزیر، بعدازاں سفیر اور اٹلی میں بطور سفیر میری تعیناتی کے دوران مجھے منیر احمد خان سے اور اس کے ادارے سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اٹلی میں ہم اطالوی ایٹمی طاقت کے اہلکاروں سے قریبی روابط استوار کر چکے تھے اور انہی کے ذریعے ڈاکٹر موسی سے (جو کہ Siesmology کے بہت مشہور سائنس دان تھے) جو ایٹمی توانائی پلانٹ کے لیے چشمہ کے مقام پر Siesmology (زلزلہ پیما مرکز) کی تحقیق کے لیے پاکستان آئے۔ اطالوی حکومت پاکستان میں توانائی کا بحران کم کرنے کے لیے تکنیکی و اقتصادی مدد فراہم کرنے کو تیار تھی مگر ہماری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

بون میں وزیر، اٹلی اور جرمنی میں سفیر کی حیثیت سے مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ میں انہیں کئی بار پہلے بھی E7 اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ پر مل چکا تھا۔ بون میں ان کا ادارہ اکرام خان کے زیر سرپرستی تھا جو سادہ لوح شخص تھے۔ میری سوچ کے مطابق ڈاکٹر اے کیو خان، منیر خان سے بہت زیادہ قابل تھے۔ قدیر خان اپنے اہداف کے حوالے سے بالکل واضح تھے۔ منیر خان میں خودارادیت کی کمی تھی۔ ڈاکٹر قدیر خان کے فوری فیصلہ لینے کے باعث ان کا ہدف تیزی سے منزل تک پہنچا۔ منیر خان نے صرف لاہور سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے بعد اس نے نارتھ کیلورینا کے پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ سے جس کی ساکھ کم تھی، 9 مہینے کا ڈپلومہ کورس کیا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں تھی مگر وہ اپنے آپ کو ڈاکٹر منیر خان کہلوایا کرتا تھا۔

1981ء کے اختتام پر جنرل ضیاالحق نے مجھے بتایا کہ ایٹم بم کی تیاری کے حوالے سے ان کی تحقیقات کے مطابق منیر خان اور ان کی ٹیم کوئی کامیابی حاصل نہیں

کرپائی۔ چند ماہرین نے بتایا کہ منیر خان کبھی بھی بم نہیں بنا پائیں گے جب کہ کہوٹہ میں یورینیئم کی افزودگی جلد مکمل ہو جائے گی۔

انہوں نے مجھ سے بات کی اور جنرل ضامن نقوی سے بات کی اور فیصلہ کیا کہ یہ ہدف فوری طور پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو سونپ دیا جائے۔ اگلے روز ڈاکٹر خان کو بلایا گیا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ ایٹم بم بنانے کے لیے تمام طاقتیں بروئے کار لائیں۔ جنرل ضیاالحق نے ہمیں بتایا کہ ہم چاروں کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں۔ غلام اسحاق خان اور جنرل کے ایم عارف کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ ڈاکٹر خان نے کسی قسم کے خدشات اور پریشانی کا اظہار نہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ذمہ داری پورا کرنے کے لیے بھرپور کوشش کریں گے۔

دسمبر 1984ء کے وسط میں جنرل ضیاالحق نے مجھ سے بات کی۔ وہ بہت خوش اور پُر اعتماد تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر خان کا خط دکھایا جو انہوں نے 10 دسمبر کو لکھا تھا جس میں صدر پاکستان کو خوشخبری دی گئی تھی کہ تمام Cold Tests کامیاب ہوئے ہیں اور وہ دس روز میں ایٹم بم کو Explode کر سکتے ہیں۔ جنرل ضیاالحق بے حد خوش تھے۔

1985ء کے وسط میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میری کاوش کو سننے کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ ان کے دماغ پر کچھ بوجھ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جنرل نقوی کو تمام ڈرائنگز اور تیاری میں درکار مراحل کی تفصیلات ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز کے ڈپوزٹ میں رکھنے کی ہدایت کی ہے تاکہ وہ محفوظ رہیں۔ انہیں بتایا گیا کہ منیر اے خان کے قریبی ساتھی جنرل عارف نے تمام ڈرائنگز منیر خان کو دے دیں تاکہ وہ ڈاکٹر قدیر خان کی کامیابیوں کو نقل کر سکیں۔ عارف کو غلام اسحاق خان سے پتا چلا کہ ڈاکٹر خان اپنا ہدف حاصل کر چکے تھے۔ وہ کہوٹہ گئے اور ڈاکٹر خان سے نیوکلیئر آلات اور ڈرائنگز دکھانے کو کہا۔ ڈاکٹر خان نے معصومیت سے انہیں بتا دیا کہ ان سب معلومات کا ایک سیٹ ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز کے پاس جمع ہے۔ اس طرح انہیں ڈرائنگز کا علم ہوا اور وہ منیر تک منتقل ہوئیں۔ جنرل عارف ہمیشہ ڈاکٹر خان کی حوصلہ شکنی میں مصروف رہے۔

ایٹمی پروگرام میں درکار سامان کے لیے
بون (مغربی جرمنی) آفس کا قیام

ایٹمی پروگرام کے لیے درکار سامان کے حصول کی غرض سے 1977ء کے شروع میں بون دفتر قائم ہوا۔ اکرام الحق کو فروری 1977ء میں وزیر کی حیثیت سے اس دفتر کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اگست 1977ء میں ڈاکار سے بون تبادلہ ہوا۔ بعد ازاں مجھے صدر ضیاالحق نے بتایا کہ تبادلہ کا مقصد سامان کے حصول میں تیزی لانا اور اس عمل کو محفوظ بنانا تھا۔ صدر ضیاالحق نیوکلیئر پروگرام کے بھرپور حامی تھے۔ سفیر افتخار علی نے حیران کن طور پر اس طرح سے ہماری مدد نہ کی جس انداز میں انہیں کرنی چاہیے تھی۔ ان کے بعد دوسرے اہم عہدہ دار نے بھی خود کو اس عمل سے دُور رکھا۔ چوں کہ دونوں پہلی بار بون تعینات ہوئے تھے، لہٰذا ان کی جرمن سیاسی، افسر شاہی اور صنعتی حلقوں سے واقفیت نہ تھی۔ میری پیرس تعیناتی کی خواہش کو اس وجہ سے نظر انداز کیا گیا کہ بون میں میری موجودگی ضروری تھی۔ بون پہنچتے ہی مجھے کام شروع کرنے میں کوئی وقت نہ لگا کیوں کہ وہ تمام احباب جو میری گزشتہ تعیناتی کے دوران جرمن محکمہ میں نچلے اور متوسط عہدوں پر تھے، اب اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ سامان کی ترسیل اور خرید کے حوالے سے تمام معاملات پر ان کے احکامات اثر انداز ہوتے تھے۔ جرمنی میں بطور تھرڈ/ سیکنڈ سیکریٹری پہلی تعیناتی کے دوران میں جرمن معاشی امداد، اجناس کی امداد اور برآمدی قرضہ جات کے حوالے سے خدمات انجام دے چکا تھا۔ میں پاکستان میں جرمن سرمایہ کاری کا بھی ذمہ دار تھا۔ اگرچہ ہمارا الگ کمرشل سیکشن تھا، تاہم میں ان معاملات میں خود مصروف کار رہا۔

سفارتخانہ کا انسپکشن سیکشن بھی خاصا بڑا تھا جس کے اختیارات میں پاکستان میں موجود متعدد سرکاری اداروں کی جانب سے جرمنی اور دیگر یورپی ممالک سے خرید کردہ ساز و سامان کی انسپکشن بھی شامل تھی۔ اسی وجہ سے ہمیں جرمنی اور یورپی ممالک میں صنعتوں تک رسائی ملی۔

اکرام الحق اس سے پیشتر بھی بون میں پاکستان اسلحہ فیکٹری واہ کے نمائندہ کی

حیثیت سے ذمہ داریاں انجام دے چکے تھے۔ متعدد صنعتوں تک رسائی آسان تھی۔ ڈاکٹر خان کو یورپ میں متعدد سپلائرز کا علم تھا جن کے ذریعے ہم وقت ضائع کیے بغیر پروڈیوسرز تک بھی پہنچ گئے۔ جرمنوں کی سوچ کے مطابق دولت ہی اصل طاقت ہے۔ اسی وجہ سے اقتصادی ترقی جرمن قوم کی نفسیات کا حصہ تھی۔ جرمنی اور پاکستان کے مفادات متصل تھے۔ میں نے قریباً ہر اس جرمن عہدیدار سے رابطہ کیا جو ہمیں سامان کی خرید و ترسیل میں مدد دے سکتا تھا۔ میرے لیے ہر سطح پر بیوروکریٹس، سیاستدانوں اور صنعتی و کاروباری اداروں سے رابطہ کرنا آسان تھا۔ متعدد جرمن Carnivals اور Fasching پارٹیز سماجی تقریبات میں شرکت کے باعث میں اہم جرمن حکام کے قریب تھا۔ ہم میں سے اکثر ایک دوسرے کو پہلے نام سے پکارا کرتے تھے اور میری اہم جرمن عہدیداروں سے دوستی تھی۔

بحیثیت وزیر بون آمد پر مجھے فوری ادراک ہوا کہ جرمن پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے ہمارے تعلقات خراب تھے۔ میں نے فوراً اہم اداروں اور صحافیوں سے ملاقاتیں کیں اور پاکستان کا بہتر امیج اور ان کا پاکستان مخالف پروپیگنڈا کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔

جرمنی سے یورینیئم افزودگی کے لیے UF6 اور کولیکشن سسٹم (Collection System) حاصل کیا گیا۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ صرف امریکی بحری جہاز ہی اسے پاکستان پہنچا سکتا تھا۔ اس خدشہ کے پیش نظر کہ امریکہ یہ پلانٹ اس لیے نہ ہتھیا لے کہ یہ پاکستان جارہا ہے، اسے پہلے دبئی اور پھر پاکستان بھیجا گیا۔ پلانٹ کلون میں واقع لیبولڈ ہیرس (Leybold Heraus) سے حاصل کیا گیا تھا۔ جرمن سپلائرز نے اکرام الحق کو بتایا کہ ترسیل کا علم خفیہ ہونا چاہیے اور عام شخص کو اس کی بھنک بھی نہ پڑے۔

لیبولڈ ہیرس میں لرش نامی انتہائی لائق انجینئر تھا۔ ڈاکٹر خان اور دیگر پاکستانی انجینئر سٹٹگارٹ میں مختلف مواقع پر اس سے ملاقات کے دوران کہوٹہ میں درپیش چند تکنیکی مسائل پر رہنمائی لیتے اور جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا تو اس کو حل کرواتے۔

اکرام الحق نے مجھے بتایا کہ ان کی بون روانگی سے قبل ڈاکٹر خان نے انہیں کہا تھا کہ تمام سامان دو سال کے اندر بھیجنے کی کوشش کریں۔ یہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تھا جس دوران اس امر کو صیغہ راز میں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ اندیشہ موجود تھا کہ مخالفین کو قریباً دو برسوں تک ہماری کارروائیوں کا علم ہو جائے گا۔ پاکستان میں زیادہ تر سامان پی آئی اے، LUFTHANZA اور کبھی کبھی پاک فضائیہ کے سی130 کے ذریعے آتا۔

یورینیم افزودگی کے لیے UF6 اور دیگر سامان کا ایک اور آرڈر سوئٹزرلینڈ کی ایک کمپنی کو دیا گیا۔ پیشگی رقم ایک پاکستانی بینک کے ذریعے ادا کی گئی تاہم سپلائر سے کوئی ضمانت نہ لی گئی۔ سوئس حکومت کو اس کا علم ہو گیا اور تمام سامان قبضہ میں کر لیا گیا۔ سامان پیدا کرنے والی کمپنی نے پیشگی رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا موقف تھا کہ تیاری کے لیے درکار مواد اور پارٹس کی خریداری پر ان کا خاصا سرمایہ خرچ ہوا تھا۔ ہمارے دباؤ ڈالنے پر یہ رقم واپس کر دی گئی۔

پاکستان نے افزودگی پلانٹ کے لیے بھی سوئس کمپنی سے VALVES خریدے۔ پابندی کے ڈر سے پاکستان نے فیکٹری میں ملازم مسٹر ٹنر کی مدد سے ڈرائنگ حاصل کر لی۔ اکرام الحق زیورخ میں ٹنر (Tinner) سے پہلے سے مقرر کردہ مقام پر ملے۔ ٹنر کے بریف کیس میں ڈرائنگ تھی، تاہم اسے خطرہ تھا مبادا سوئس حکام دونوں کو گرفتار کر لیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ تمام ڈرائنگز قسطوں میں بون بھیجی جائے۔ ٹنر نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ڈرائنگز بون پہنچ گئیں۔ ٹنر نے ایک اپنی فیکٹری بنا لی اور پاکستان کو سامان سپلائی کرتا رہا۔ ٹنر کے بیٹے کا پاکستان سے تعلق تھا۔ سوئس حکام نے اسے گرفتار کر لیا۔ ٹنر امریکہ کو بھی سامان سپلائی کرتا تھا۔ امریکہ کے کہنے پر سوئس اتھارٹی نے ٹنر کے بیٹے کو رہا کر دیا۔

پاکستان میں بجلی کی کمی کے باعث ہمیں انورٹرز (بڑے حجم کے یو پی ایس) کی ضرورت تھی۔ ان کا مقصد سینٹری فیوجز کو بجلی کی بندش کے باعث نقصان سے محفوظ رکھنا تھا۔ انگلینڈ کی ایمرسن الیکٹرانکس سے تیس انورٹر خریدے گئے۔ اس وقت ان کی

برآمدات پر پابندی نہیں تھی۔

کینیڈا میں مقیم پاکستانی انجینئر اور ڈاکٹر خان کے دوست عبدالعزیز خان پاکستان آئے اور انورٹرز کو بہتر بنانے کے لیے تجویز دی۔ چنانچہ ایمرسن الیکٹریکل کو مطلوبہ پرزوں کا آرڈر دیا گیا۔ انورٹرز یہ کہہ کر درآمد کیے گئے کہ انہیں ٹیکسٹائل انڈسٹری میں استعمال کرنا ہے لیکن جب پارٹس منگوائے گئے تو کمپنی کو علم ہو گیا کہ ان کا مقصد نیوکلیئر پروگرام سے وابستہ ہے۔ یہ آرڈر جرمن سپلائر مسٹر پیفل کے ذریعے دیا گیا۔

100 انورٹرز کا دوسرا آرڈر لندن میں ایک پاکستانی کے ذریعے دیا گیا کیوں کہ جرمن سپلائر کے ذریعے وہ مہنگے پڑتے تھے۔ غالباً جرمن سپلائر نے برطانوی حکام کو مطلع کر دیا اور برطانیہ میں ایک یہودی رکن پارلیمنٹ نے یہ نکتہ اٹھایا کہ پاکستان ایٹمی پروگرام کے لیے انورٹرز خرید رہا ہے۔ اس وقت تک انورٹرز کی برآمد پر کوئی پابندی نہ تھی مگر برطانوی حکام حرکت میں آئے اور پاکستان کو برآمد پر پابندی عائد کر دی گئی۔ انورٹرز کے لیے آرڈر بون آفس کے ذریعے دیا گیا تھا۔

چند حصے (bellows) ایک فرانسیسی کمپنی بناتی تھی۔ انہیں یہ حصے بنانے کے لیے انورٹرز بھیجے گئے۔ فرانسیسی حکومت نے ان حصوں کی ترسیل پر پابندی عائد کرتے ہوئے انہیں اپنے قبضہ میں کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ہم یہ حصے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے کیوں کہ وہ فرانس کے تیار کردہ نہیں تھے۔ بون میں ہمارے دفتر نے ڈی ایل ایف ہالینڈ سے MARAGING سٹیل ٹیوبز اور جرمنی سے چند مشینیں خریدیں جن کی مدد سے پاکستان میں کچھ پارٹس Bellows بننے شروع کر دیئے۔

گیس فیڈ اور کولیکشن سسٹم کا ایک اور پلانٹ جرمنی سے خریدا گیا۔ اسے بلاواسطہ پاکستان بھیجنا خطرناک تھا۔ اسے (ٹرک) کے ذریعے لکومبرگ (Luxemberg) بھیجا گیا۔ لہٰذا لکومبرگ سے بذریعہ کارگو ہوائی جہاز دبئی اور وہاں سے پاکستان بھیجا گیا تا کہ اس کو ضبط نہ کیا جا سکے۔ پلانٹ اس قدر وزنی تھا کہ دبئی میں اسے اتارنا اور کسی دوسرے جہاز میں دوبارہ چڑھانا بہت مشکل تھا۔ کارگو جہاز کا پائلٹ اسلام

آباد پرواز کے لیے رضامند ہو گیا۔ اسے خدمات کے صلہ میں 50 ہزار امریکی ڈالر دیئے گئے۔

کہوٹہ کے لیے فرانس سے بھی سامان خریدا گیا۔ فرانسیسی حکام نیوکلیئر سامان کی ترسیل کے حوالے سے دباؤ کا شکار تھے اسی لیے پہلے یہ سامان بذریعہ سڑک سوئٹزرلینڈ بھیجا گیا اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان پہنچا۔

بین الاقوامی یہودی کمیونٹی اور امریکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف تھے۔ انہوں نے ایسی کہانیاں گھڑیں کہ کسی طرح پاکستان پر اس کی وجہ سے الزام لگایا جا سکے۔

ایک یہودی مسٹر لووینتھل (LOWENTHAL) سیکنڈ جرمن ٹی وی چینل (زیڈ ڈی ایف) میں اہم عہدہ پر فائز تھے۔ ان کا خاندان ہٹلر کے یہودی نسل کو ختم کرنے کے حکم پر مار دیا گیا تھا۔ وہ واحد رکن تھے جو زندہ بچ گئے۔ اگرچہ ان کا خاندان ہٹلر کے احکامات پر قتل ہوا تاہم انہیں غصہ مسلمانوں پر تھا۔

لووینتھل نے 1979ء میں سفیر افتخار علی کو فون پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے انٹرویو کی درخواست کی۔ افتخار علی نے انٹرویو دینے کے حوالے سے میری رائے جاننا چاہی۔ میں نے کہا کہ لووینتھل کو آنے دیں۔ سفیر کے دفتر میں انٹرویو ہوا۔ مجھے معلوم نہ ہوا کہ کیمروں کا رخ سفیر کی بجائے میری طرف ہے۔ اگلے روز یہ انٹرویو نشر ہوا جس میں لووینتھل نے پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انٹرویو میرے متعلق تھا۔ یہ الزام بھی لگایا گیا کہ میں صدر پاکستان کا فرسٹ کزن ہوں، لہٰذا مجھے ایٹمی پروگرام کے لیے حساس سامان خریدنے کی غرض سے جرمنی تعینات کیا گیا ہے۔

اگلی صبح سفیر افتخار علی نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور وہ خط دکھایا جس میں انہوں نے سیکریٹری خارجہ کو لکھا تھا کہ اس پروگرام کے نشر ہونے پر ان کے خیال میں جرمن حکام تیزی سے حرکت میں آئیں گے اور پاکستان کو حساس سامان کی برآمدات پر پابندی لگا دیں گے۔

انہوں نے اپنے خدشہ کو درست قرار دیتے ہوئے میری رائے جاننا چاہی۔
میں نے ان سے کہا کہ آپ کا خدشہ درست نہیں۔ جرمنی، پاکستان کو برآمدات پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائے گا۔ اس لیے خط کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا جائے۔ ٹی وی پروگرام کے نشر ہونے سے کچھ دن پہلے میں نے فری ڈیموکریٹک پارٹی کی دفاع کے حوالے سے میٹنگ میں شرکت کی تھی جو جرمنی سے حساس اسلحہ کی برآمدات کے خلاف تھی۔ جرمن وائس چانسلر اور وزیر خارجہ گینشر ایف ڈی پی کے چیئرمین تھے۔ دفاع کے موضوع پر پارٹی میٹنگ کے دوران میں نے پاکستان کو M48 امریکی ٹینکوں کی برآمد کے سوال پر وزیر اقتصادیات سے بات کی تھی۔ وہ برآمدات کی اجازت کے ذمہ دار تھے اور جرمنی سے حساس سامان (Equipment) کی برآمد کے حوالے سے ان کا موقف تھا کہ امریکہ کے نزدیک وہ اکیلا ہی ہتھیار اور حساس سامان برآمد کر سکتا ہے جب کہ اس نے دوسروں کو ایسا کرنے سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ وزیر نے مزید کہا کہ جرمنی کو بھی پیسے چاہیے، لہٰذا وہ حساس سامان کی فروخت نہیں روکیں گے۔ پاکستان کا نیوکلیئر پروگرام بھی زیر بحث آیا۔ تاہم پارٹی قائدین نے اس حوالے سے بات کرنے کی اجازت نہ دی۔
میں اپنے سفیر سے یہ کہنے میں درست تھا کہ جرمنی پابندیاں نہیں لگائے گا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ انہوں نے خط پھاڑ دیا لیکن میرے خیال میں بعد ازاں انہوں نے دفتر خارجہ کو ٹیلی فون پر اطلاع کر دی۔

میرے علم میں آیا کہ وزیر خزانہ غلام اسحاق خان کا بھی یہی خیال تھا کہ جرمن حکام پاکستان کو سامان کی ترسیل پر پابندی لگا دیں گے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے زیادہ فنڈ مہیا کر دیئے تا کہ کہیں سے بھی جلد از جلد سامان خریدا جا سکے۔

جرمن سیکنڈ ٹی وی چینل پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مخالفت میں رپورٹ نشر ہوئی تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ہمیں متعدد کمپنیوں کا بتایا جن کے ذریعے مطلوبہ سامان خریدا جائے۔

ٹی وی پر لو ویتھل کا پروگرام نشر ہونے کے کچھ روز بعد میں نے اس سے رابطہ

کیا اور MAINZ میں ملنے گیا، جہاں ہم نے کھانا کھایا اور اس کے پروگرام پر بحث کی۔ میں نے یہ حقیقت یاد دلائی کہ یہودیوں کے قتل عام میں مسلمان نہیں بلکہ نازی جرمن ملوث تھے۔ پاکستان یہودی مذہب کا احترام کرتا ہے۔ فلسطین کے لیے ہماری حمایت سیاسی بنیادوں پر تھی جس کا تعلق عقائد یا رنگ و نسل سے ہرگز نہیں۔ ہماری گفتگو کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا اور اس نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر منفی پراپیگنڈا روک دیا۔ یاد رہے کہ 1979ء سے لے کر 1987ء تقریباً 8 سال کے عرصہ میں LOWENTHAL نے پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کے خلاف پھر کوئی پروگرام نہیں کیا۔ مزید برآں، ہم اچھے دوست بن گئے اور اس حوالے سے جاری پاکستان کے مخالف پراپیگنڈا روکنے میں لووینتھل نے مدد کی۔

اٹلی میں امریکی سفیر میکسویل راب، امریکہ میں صف اوّل کے یہودیوں اور صدر ریگن کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکے تھے تاہم بہت خوش مزاج اور مجھ سے اچھا برتاؤ کرتے۔ وہ استقبالیہ کا اہتمام کرتے رہتے جس میں مشہور امریکی و اطالوی فلمی اداکاروں اور فنکاروں کو مدعو کیا جاتا۔ انہی تقریبات کے دوران میری ملاقات جینا لولو بریگیڈا، پال نیومین اور صوفیہ لورین سے ہوئی۔ جینا ڈنر کے لیے ہمارے گھر بھی آئی۔

ایک دن ایمبیسیڈر راب نے مجھے دفتر میں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ میں آپ کے گھر آ کر آپ کے ساتھ کافی پینا چاہتا ہوں میرا گھر (VIADE VILLA PEOPLI) پیلی میں تھا جو کہ پرانے ROMAN کھنڈرات TERME DE CARCALA کے پاس تھا۔ راب کو علم تھا کہ میں صدر ضیاالحق اور بیگم ضیاالحق کا فرسٹ کزن ہوں۔ لہٰذا انہوں نے مجھ سے کہا کہ صدر ریگن کی اجازت سے تجویز لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اس کو ذاتی طور پر ضیاالحق کو پیش کروں۔ انہوں نے کہا کہ اگر پاکستان اسرائیل کی مخالفت بند کر دے تو نہ صرف اس کے نیوکلیئر پروگرام کے خلاف پراپیگنڈا بند ہو جائے گا بلکہ بھرپور امریکی اقتصادی امداد بھی حاصل ہوگی۔ انہوں نے کہا

کہ اگر ایسا ممکن ہوگیا تو پاکستان کو کثیر امریکی امداد بھی ملے گی جو مصر کو امریکی امداد سے زیادہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ یہ پیشکش صدر پاکستان تک پہنچ جائے گی۔ یہ نا قابل قبول تجویز تھی تاہم میں نے صدر ضیا کو یہ پیغام دے دیا۔ راب کی یہ تجویز چوں کہ پاکستان کی اسرائیل اور فلسطین کی پالیسی کے خلاف تھی، اس لیے اس کا قبول کرنا پاکستان کے لیے ناممکن تھا۔

بون میں بطور پاکستان سفیر پہنچنے پر میں نے فوراً LOWENTHAL سے رابطہ قائم کیا اور اس کو ملنے کے لیے MAINZ چلا گیا۔ وہ مجھے مل کر بہت خوش ہوا۔ میں نے اسے Kuingswinter اپنے گھر کھانے کے لیے مدعو کیا۔ میرے بون میں قیام کے تمام عرصہ کے دوران ہم اچھے دوست رہے۔

بیوریا کے وزیر اعظم STRAUSS جو کہ کرسچن سوشلسٹ یونین کے چیئرمین بھی تھے، پاکستان کے قریبی دوست تھے۔ SIEMENS اور بہت سی دوسری صنعتیں MUNICH اور بیوریا کے دوسرے شہروں میں تھیں۔ اکثر ان کے ساتھ کئی معاملات حل کرنے میں اور حساس ہتھیار لینے میں درپیش رکاوٹوں کو دُور کرنے میں STRAUSS کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ پاکستان کے کئی اور معاملات میں بھی STRAUSS کی مدد درکار ہوتی۔ ایک دن Fasching تقریب کے دوران 1985ء میں نے پوری شام STRAUSS اور اس کے خاندان کے ساتھ گزاری۔ STRAUSS بیئر پینے میں مشغول تھے۔ جب رات کے 2 بج گئے تو STRAUSS کی اہلیہ نے اسے کہا کہ پہلے وحید کی بات سنو اور پھر کھیل تماشے سے لطف اندوز ہو۔ STRAUSS اور اس کے سیاسی ساتھی مجھے کہا کرتے تھے کہ پاکستان کو اپنا نیوکلیئر بم جلدی بنالینا چاہیے۔

1987ء کے وسط میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو نقصان پہنچانے کی غرض سے تنقید کی خاطر شمالی جرمنی کے ٹی وی (NDF) نے پاکستان کو ہمارے ایٹمی پروگرام کے بارے میں بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ٹی وی کے مرکزی اینکر نے اس معاملے پر میرے انٹرویو کی درخواست کی، میں فوراً راضی ہوگیا۔ اس کی بدقسمتی اور میری خوش قسمتی

سے، میرے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے پُرزور دفاع اور تحفظ اور اینکر کی اس معاملے میں بے خبری اور کم معلومات کے باعث اس نے ٹی وی کے ناظرین کے سامنے ایک بگڑا ہوا منظر ہی پیش کیا۔ واضح طور پر اس نے اپنا ہوم ورک نہ کیا تھا جب کہ ہماری صورتِ حال مجھے از بر تھی۔ پاکستان، سارلینڈ کے مشہور سار سٹیل سے اپنے ایٹمی پروگرام کے لیے خاص قسم کا سٹیل درآمد کیا کرتا تھا۔ جب میں بون میں وزیر تھا تو میں نے اس فیکٹری کا دورہ کیا تھا اور اس کے بعد جب میں جرمنی میں سفیر بن گیا تب بھی۔ ہمیں پروڈیوسرز کے ساتھ کچھ مسئلے تھے، میں کچھ مواقع پر اعلیٰ انتظامیہ سے ملا اور ہم نے کامیابی سے وہ مسائل حل کر لیے۔ اپنے بے قابو جذبات میں ٹی وی اینکر نے مجھے کہا کہ پاکستان، سار سٹیل فیکٹری سے خاص قسم کے سٹیل کی سمگلنگ میں ملوث تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آیا اس فیکٹری سے سٹیل درآمد کرنے پر کوئی پابندیاں تھیں۔ اس نے اتفاق کیا کہ ایسی کوئی پابندی نہ تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ جب درآمد پر کوئی پابندی نہ تھی تو وہ کس طرح الزام عائد کر سکتا تھا کہ پاکستان سمگلنگ میں ملوث تھا۔ پاکستان کوئی بدمعاش وجود نہیں بلکہ ایک آزاد ریاست تھا۔ اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے ہم جو کچھ ضروری ہوتا کرتے، یہ ہمارا حق تھا۔ بھارت 1974ء میں ایٹمی دھماکے کر چکا تھا اور کسی نے تنقید نہ کی تھی۔ کسی کو بھی ہمارے ایٹمی پروگرام پر انگلی اٹھانے کا حق نہ تھا۔

میں نے اسے مزید بتایا کہ جب پاکستان پر میٹریل اور کاغذات (DRAWINGS) کی سمگلنگ کا الزام دہرا جا رہا تھا، کسی نے پرواہ نہ کی تھی کہ دوسرے ممالک کیا کر رہے تھے۔ امریکہ نے جرمن سپیس سینٹر Trave Munde سے وان براؤن کو اغوا کر لیا تھا اور اپنے خلائی پروگرام کے لیے اسے امریکہ لے گیا تھا۔

اینکر کو جواب دینے میں خاصی دشواری پیش آئی اور اس نے رخصت لی۔ وہ ٹی وی کا لائیو پروگرام تھا اور اسے جرمنی اور یورپ میں بشمول جرمن بیوروکریٹس، سیاسی اور صنعتی سیٹ اپ سے وابستہ لوگوں کے لاکھوں ناظرین دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کا

بہادری سے اور درست طور پر دفاع کرنے پر مجھے کئی حلقوں کی جانب سے بے حد داد و تحسین ملی۔

اسلام آباد سے بطور سفیر روم روانگی سے قبل میری ملاقات وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ مرزا سے ہوئی۔ جنرل مرزا نے بتایا کہ پاکستان نے پہلے پاکستانی راکٹ حتف کے لیے فیول خریدا ہے، تاہم اطالوی حکومت برآمدی اجازت نامہ میں دیر کر رہی ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ اس کام کو فوقیت دیتے ہوئے میں اطالوی حکام سے لائسنس کے حصول کی بات کروں۔ میں نے اطالوی وزیر خارجہ اور ڈپٹی وزیر خارجہ مسٹر CORTI اور سیکریٹری جنرل وزارتِ خارجہ ایمبیسیڈر مالفاتی سے ملاقات کی۔ اٹلی میں پاکستان کے برعکس وزارت خارجہ بہت طاقتور اور حساس Equipment کے لیے ایکسپورٹ پرمٹ بھی دیتی ہے۔

میں برآمدی اجازت نامہ کے انچارج ڈائریکٹر جنرل کو ملا جنہوں نے بتایا کہ اگرچہ اٹلی کے قانون کے مطابق FUEL کو ایکسپورٹ کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر امریکی حکومت ہم پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ ہم پاکستان کو FUEL درآمد نہ کرنے دیں۔ میں نے اطالوی دفتر خارجہ کے سیکریٹری جنرل ایمبیسیڈر MALFATTI سے ملاقات کی جنہوں نے میری موجودگی میں ڈائریکٹر جنرل کو فون کیا اور برآمدی اجازت نامہ میں تاخیر کے بارے میں دریافت کیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو مجھے دیا تھا۔ اس کی وجہ امریکی دباؤ تھا۔ MALFATTI برہم ہوئے اور ڈائریکٹر جنرل کو اجازت نامہ فوری جاری کرنے کا حکم دیا۔ MALFATTI نے مجھے کافی کے لیے روکا اور اسی دوران اجازت نامہ جاری ہو گیا۔ اٹلی سے درآمد شدہ ایندھن کی بدولت پاکستان پہلے میزائل کے تجربہ میں کامیاب ہوا جس کے نتیجے میں نیوکلیئر ہتھیاروں کے ڈیلیوری سسٹم بننے کی طرف پیش قدمی ہوئی۔

سینٹری فیوجز کے لیے خصوصی مقناطیس کی خرید

ابتدائی طور پر خصوصی مقناطیس بون میں ایک جرمن کمپنی سے خریدے گئے۔

انہیں واچ برگ پیک (WachtBerg-Pech) میں واقع اکرام الحق کی رہائش گاہ پر پہنچایا گیا۔ یہ اس خدشہ کے پیش نظر کیا گیا کہ کہیں جرمن حکومت پاکستان کو ان آلات کی برآمد پر پابندی نہ لگا دے۔ پیک سے Diplomatic Bags کے ذریعے یہ مقناطیس پاکستان بھیجے جاتے رہے۔ جیسے ہی جرمنی نے پابندی عائد کی پاکستان نے انگلینڈ سے خریدنا شروع کر دیئے۔ انگلینڈ کے پابندی عائد کرتے ہی ہم نے اٹلی میں ایک فیکٹری ڈھونڈ لی جہاں سے مقناطیس خریدے گئے۔

اکرام الحق کے بعد عظمت اللہ، نیوکلیئر پروگرام کے لیے سامان کی خرید کے سربراہ مقرر ہوئے۔ میں ان دنوں چھٹیوں پر تھا جب انہوں نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ انگلینڈ نے بھی پابندی لگا دی ہے، لہٰذا مقناطیس کہیں اور سے ڈھونڈنا ہوں گے۔ میں نے پاکستان میں قیام مختصر کیا اور روم روانہ ہوا۔ ایئرپورٹ سے ہی سیدھا میلان پہنچا جہاں سے دفتر کی گاڑی میں اس فیکٹری گیا۔ فیکٹری مالک سے ملاقات ہوئی جس نے مجھے بتایا کہ اگرچہ سرکاری طور پر میگنٹس کو Export کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بعض بیرونی طاقتیں (امریکہ) اطالوی حکومت کو مجبور کر رہی ہیں کہ Magnets پاکستان کو ایکسپورٹ نہ کیا جائے۔ مالک خود Magnets کو بیچنے کے لیے تیار تھا۔ اس صورت حال میں مَیں نے روم میں اعلیٰ عہدوں پر اپنے دوستوں (Highups) سے رابطہ کیا اور انہوں نے Magnets پاکستان بھیجنے کی اجازت دے دی۔ میں نے عظمت اللہ کو بتایا کہ وہ اٹلی سے مقناطیس انگلستان کی نسبت ایک تہائی قیمت پر خرید سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے مجھ سے پہلے سفیر ایس۔ اے۔ ڈی بخاری کو وقت سے پہلے ہی تبدیل کر دیا گیا تھا چوں کہ ضیا نے اسے کمزور سمجھا اور ان کے خیال میں وہ ہمارے نیوکلیئر پروگرام کے لیے سامان نہیں لے سکتا تھا۔ اس کا اثر ورسوخ کم تھا اور وہ پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کو آگے بڑھانے میں ناکام تھا۔ ضیاالحق نے سمجھ لیا کہ میرے لیے اپنی پہلی دو پوسٹنگ، جن میں مَیں نے بہت سے اعلیٰ جرمن عہدیدار دوست بنائے تھے، کی وجہ سے میرے لیے نیوکلیئر پروگرام کو آگے بڑھانا آسان تھا۔ جو کام

دوسرے سفیر نہیں کر سکتے تھے، ضیا کے خیال میں وہ کام میں کر سکتا تھا۔ جرمن بیورو کریسی، سیاستدانوں اور صنعتکاروں کے ساتھ میرے قریبی تعلقات تھے۔ صدر ضیا بخوبی جانتے تھے کہ مجھے اپنا کام کرنے کے لیے وقت درکار نہیں تھا۔

امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی جانب سے مسلسل دباؤ کے باعث ایٹمی پروگرام کے لیے سامان لینے پر کچھ پابندیاں عائد ہو گئیں تاہم اس کا کوئی مضر اثر نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی منصوبہ بندی اور فوری فیصلہ سازی کے باعث کہوٹہ لیبارٹری مطلوبہ سامان اور آلات بنانے کی صلاحیت حاصل کر چکی تھی۔

جرمنی نے پاکستان کو نیوکلیئر پاور پلانٹ دینے کی ہامی بھری تھی۔ سیکریٹری خارجہ نیاز نائیک، استنبول آئے جنہیں میں نے بتایا کہ جرمنی نے ان شرائط پر پاور پلانٹ دینے کی ہامی بھری جن پر برازیل کو دیا گیا تھا۔ پاکستان کے لیے شرائط قابل قبول تھیں مگر جرمن حکومت اپنی پیشکش پر عمل نہ کر سکی۔ سٹیٹ سیکریٹری ڈاکٹر لینڈرت نے مجھے بتایا کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کے مشترکہ دباؤ کے باعث جرمنی ایسا کرنے میں ناکام رہا۔

میں بون میں اگست 1977ء سے جولائی 1981ء تک وزیر، اٹلی میں جولائی 1981ء سے دسمبر 1984ء تک سفیر اور بون میں دسمبر 1984ء سے اکتوبر 1987ء تک سفیر رہا۔ پاکستانی نیوکلیئر و میزائل پروگرام کے لیے سامان کے حصول میں دس سال کا یہ عرصہ انتہائی اہم رہا۔ جرمنی میں قانون وضوابط کے مطابق مشن کا سربراہ اور اس کا نائب سامان کی درآمد و برآمد کی کسٹمز اتھارٹی پر دستخط کے مجاز تھے۔ غیر ملکی مشن کو جرمن دفتر خارجہ یا کسٹمز حکام کے پاس نہیں جانا پڑتا تھا۔ دراصل امریکہ اور یہودی ہی پاکستانی نیوکلیئر پروگرام کے خلاف تھے ورنہ زیادہ تر یورپی ممالک کو اس پر اعتراض نہ تھا۔ امریکی و یہودی پراپیگنڈا نے اس غیر حقیقی تصور کو جنم دیا کہ پاکستان حساس سامان سمگل کر رہا ہے۔ اس کی ایک مثال شمال جرمنی ٹی وی کو بحیثیت سفیر میرا انٹرویو تھا جس میں الزام لگایا گیا کہ پاکستان سارلینڈ میں تیار ہونے والا خاص سٹیل سمگل کر رہا ہے۔ میں نے صحافی سے پوچھا کہ کیا اس خاص سٹیل کی برآمد پر پابندی عائد ہے جس کا جواب نفی میں تھا۔ اس

پر میں نے کہا کہ جب پابندی ہی نہیں تو پاکستان پر کیسے الزام لگایا جاسکتا ہے کہ یہ سمگل کر رہا ہے۔ یہ انٹرویو جرمنی اور یورپ میں لاکھوں لوگوں نے دیکھا تھا اور میرے موقف کی تائید کی گئی تھی۔

جرمنی کے اس حوالے سے معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کی اہم وجہ یہ تھی کہ سامان مارکیٹ میں فروخت ہو رہا تھا اور سارلینڈ سے خاص سٹیل کے لیے متعلقہ سامان کی برآمد پر جرمنی میں پابندی نہیں تھی۔ زیادہ تر پراپیگنڈا بین الاقوامی یہودی لابی سے متاثر تھا جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں خاصی موثر تھی۔

میرے قیام کے دوران ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ جرمن حکام نے پاکستان کے حساس سامان خریدنے پر اعتراض کیا ہو۔ اکرام الحق بہت عمدہ اور سادہ لوح مخلص تھے۔ تاہم عظمت اللہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ وہ ضرورت سے زیادہ بولتے تھے۔ انہوں نے جرمنی میں سامان بنانے والوں اور کہوٹہ میں حکام سے فون پر براہِ راست بات کرنا شروع کر دی۔ جرمن حکام نے ان کی فون پر گفتگو ریکارڈ کر لی اور ان کی کارروائیوں پر نظر رکھی جانے لگی۔ مزید برآں، انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے لوگوں کو بتانا شروع کر دیا کہ ہم سفارتی بیگز کے ذریعے سامان پاکستان بھیج رہے تھے۔ عظمت اللہ نے پرتعیش زندگی بھی گزارنا شروع کر دی۔ انہیں مرسیڈیز خریدنے کی اجازت نہیں تھی لیکن انہوں نے کسی اور کے ذریعے مرسیڈیز 350 سیریز خریدی۔ انہوں نے جرمنی کے قوانین و ضوابط کا پاس بھی نہ رکھا۔ انہوں نے جرمن سپلائر اور کہوٹہ لیبارٹری کے ساتھ فون پر بات کرنا شروع کر دی، جس کو جرمن حکام نے ٹیپ کیا اور ان کی تمام کارروائی کا پتا چل گیا۔ اس پر جرمنی نے انہیں ناپسندیدہ شخصیت قرار دیتے ہوئے 12 گھنٹوں میں ملک چھوڑنے کا حکم کر دیا۔ پاکستان اور جرمن تعلقات کے دوران ایسا واقعہ صرف یہی ایک ہوا۔

میرے بعد مہدی مسعود، بون میں سفیر تعینات ہوئے۔ اطلاعات کے مطابق جرمن دفتر خارجہ نے ان سے حساس سامان کی نقل و حمل کی خفیہ کارروائیوں میں ملوث

ہونے پر باز پرس کی۔ انہوں نے جرمن حکام کے سامنے پاکستان کا دفاع اور اس بات سے انکار کرنے کی بجائے یہ کہا کہ ایسی غلط کارروائیوں میں پچھلا ایمبیسیڈر عبدالوحید یعنی میں ملوث تھا۔ حیران کن طور پر ایک سینئر سفارتکار پاکستان کا دفاع نہ کر سکا۔ مہدی مسعود کی ریٹائرمنٹ میں صرف ایک سال باقی تھا۔

ستار نے اپنے دوست سفیر مہدی مسعود اور جونیجو کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھے قبل از وقت جرمنی سے واپس بلایا۔ ضیاالحق نے اسے کہا کہ ان کی اجازت کے بغیر ایسا نہ کیا جائے مگر اس نے ضیاالحق کو بتائے بغیر ایسا کیا۔ ضیاالحق اس بات پر برہم تھے اور اسی لیے ستار کو عہدہ سے ہٹانے کا حکم دیا۔ مہدی مسعود، جرمنی میں انتہائی ناکام رہے۔ وہ پاکستان کے دفاع میں بھی ناکام رہے۔ جرمن حکام نے حساس آلات کی خرید کے ذمہ دار عظمت اللہ کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دیتے ہوئے 12 گھنٹے میں جرمنی چھوڑنے کا کہا۔ مہدی مسعود کو جرمن وزارتِ خارجہ میں بلا کر کہا کہ وہ Sensitive Equipment پاکستان بھیج کر غلط کام کر رہے تھے۔ مہدی مسعود نے جواب دیا کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

1988ء میں دورۂ میونخ کے دوران چند جرمن باشندوں نے پاکستانی کاروباری افراد کے توسط سے مجھے میٹنگ میں بلایا اور یورینیم افزودگی کے لیے استعمال ہونے والی زرکونیئم ٹیوب فروخت کرنے کی پیشکش کی۔ پاکستانی بزنس مین نے مجھے بتایا کہ جرمن افراد پاکستان کے ساتھ ایک انڈسٹریل جوائنٹ وینچر کرنے کے خواہاں ہیں۔ میونخ کے مضافات میں ان سے ملاقات ہوئی۔ جرمن افراد کے پاس زرکونیئم ٹیوبز سے بھرا بریف کیس تھا جو ان کے مطابق مشرقی یورپ کے کسی ملک سے منگوایا گیا۔ میں نے ان کی پیشکش یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان خودمختار ملک ہے اور اگر وہ ہمارے ساتھ کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن سے براہِ راست رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں فوراً وہاں سے چلا گیا۔

ضیاالحق نے پاکستان کا ایٹمی پروگرام انتہائی تندہی اور لگن سے پروان

چڑھایا۔انہوں نے اس مقصد کے لیے درکار تمام معاشی وسائل فراہم کیے۔افغان جنگ کے باعث امریکہ پاکستان پر دباؤ ڈالنے سے عاری تھا۔اس غرض سے کہ پاکستان کو مسلسل امریکی امداد ملتی رہے،امریکی حکام نے کانگریس کو یقین دلایا کہ پاکستان ایٹم بم نہیں بنا رہا۔

10 دسمبر 1984ء کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے صدر ضیا الحق کو خط میں خوشخبری سنائی کہ 10 دن کے نوٹس پر بم کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔جنرل ضیا الحق نے بمع کچھ اور لوگوں سے میری رائے جاننا چاہی۔میں نے اتفاق کیا کہ افغان جنگ اور امریکی امداد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بم کے Explosion کرنے کا مناسب موقع نہیں۔

ڈاکٹر خان کے متعدد مقامات پر مسلسل دوروں اور ان کے تحفظ کے لیے حکومت پاکستان نے انہیں مختلف ناموں سے متعدد سفارتی پاسپورٹ جاری کیے۔صدر ضیا نے آغا شاہی اور ان کے جانشین یعقوب علی خان کو غیر ملکی دوروں کے دوران پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر گفتگو سے سختی سے منع کیا تھا۔

جنرل ضیا الحق چند بار کہوٹہ کے دورہ پر گئے۔وہ کبھی کبھی خفیہ طور پر کہوٹہ کے سکیورٹی چیف جنرل ضامن نقوی کے ساتھ جاتے۔ڈاکٹر خان کی عمدہ کارکردگی کے باعث انجینئرنگ لیبارٹریز کا نام تبدیل کر کے ڈاکٹر عبدالقدیر خان لیبارٹریز رکھا گیا۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ضیا الحق کا مکمل تعاون حاصل تھا۔انہوں نے غلام اسحاق خان کو بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ اس سلسلہ میں جتنے بھی فنڈ درکار ہوں دیئے جائیں۔

70ء کی دہائی کے آخر میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن نے چاغی کے تجرباتی مقام کی تیاری مکمل کی۔

بھارت نے 13 مئی 1998ء کو ایک سے زائد نیوکلیئر آلات کا تجربہ کرتے ہوئے پاکستان کے لیے کوئی اور راستہ نہ چھوڑا۔اس کے نتیجے میں 28 مئی 1998ء کو دوپہر 3:16 بجے چاغی، بلوچستان میں پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کرتے ہوئے نیوکلیئر تاریخ کے نئے باب کا آغاز کیا۔ایک لمحہ میں زمین لرز گئی اور پہاڑوں کا رنگ بدل گیا۔

پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کے متعلق کچھ من گھڑت کہانیاں بھی گردش میں رہی ہیں۔ایسا بھی ذکر ہوا کہ کچھ مشہور سمگلروں نے خبریں پھیلائیں کہ انہوں نے نیوکلیئر بم کا سامان سمگل کیا۔ان قصے کہانیوں میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔سونا، چاندی، منشیات اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان سمگل کرنے والوں کو نیوکلیئر Equipment بنانے والی کمپنیوں تک پہنچ نہیں تھی اور نہ ہی ان کے پاس یہ سامان لانے کے ذرائع تھے۔ یہ کام صرف حکومت پاکستان کے سفیر اور سفارتکار ہی کر سکتے تھے۔اس کتاب کی انگریزی زبان میں ایڈیشن کی رونمائی کی تقریب جو کہ 3 مارچ 2013ء کو اسلام آباد کلب میں ہوئی، اس میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے واضح طور پر کہا کہ ایٹم بم بنانے میں ہم نے کوئی سامان سمگلنگ یا غیر قانونی طریقے سے نہیں لیا۔ جو لوگ سمگلنگ کی بات کرتے ہیں، وہ سب غلط ہیں اور یہ باتیں جھوٹ کا پلندہ ہے۔ میں ان سب چیزوں کا عینی شاہد ہوں۔ہم نے جو کچھ بھی ان کے حکم کے مطابق خریدا، مناسب پیسے دیئے اور پاکستان کا کوئی مالی نقصان نہ ہونے دیا۔ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ سالانہ بجٹ 25 ملین ڈالر تھا۔ڈاکٹر صاحب نے جنرل اسلم بیگ مرزا کو جب وہ چیف آف آرمی سٹاف بنے، ایک میٹنگ میں بتایا کہ اس وقت تک ان کے محکمہ نے صرف 250 ملین ڈالر خرچ کیے۔ جنرل اسلم بیگ کا خیال تھا کہ کہوٹہ لیبارٹری کو ہر سال تقریباً ایک بلین ڈالر کی ضرورت تھی، جو کہ بالکل غلط تھا۔ میں نے پہلے بھی یہ بات کی ہے کہ ہم نے تمام Equipment قانونی طریقہ سے خریدا اور بغیر کسی Regulation Export کو Violate کرتے ہوئے پاکستان بھجوایا۔ جب کبھی ہمیں خدشہ ہوا کہ سامان کو راستے میں امریکہ ضبط نہ کر لے ہم نے سامان کی منزل پاکستان کی بجائے دبئی یا کسی اور ملک کو بنایا اس طرح ہمارا سامان باحفاظت پاکستان پہنچ گیا۔

بھٹو نے ایٹم بم بنانے کا آغاز کیا۔ضیاالحق نے ایٹم بم بنانے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔البتہ ایٹم بم Explode کرنے کا عمل میاں نواز شریف کے دوسرے دورِ حکومت میں ہوا۔ایٹمی دھماکے میاں نواز شریف کی حکومت میں کیے گئے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس کا کریڈٹ میاں نواز شریف کی حکومت کو جاتا ہے۔

پرویز مشرف پاکستان کا بدترین حکمران تھا۔ اس نے لال مسجد کہ جسے پُرامن طریقے سے قابو کیا جا سکتا تھا، گولہ بارود سے تباہ کر دیا جس سے سینکڑوں انسانی جانوں کا نقصان ہوا۔ نواب محمد اکبر خان بگٹی جو کہ ایک وفادار اور محب الوطن پاکستانی تھے اور جو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں تھے، انہیں بھی مروا دیا۔

پرویز مشرف کسی برائی سے پیچھے نہ رہا تھا۔ اس کی سوچ تھی کہ محسن پاکستان ڈاکٹر خان کو امریکہ کے حوالے کر دیا جائے۔ میں نے سنا کہ پرویز مشرف، ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کو امریکہ کے حوالے کرنے پر تیار تھا۔ امریکن سی آئی اے کا جہاز چکلالہ ایئرپورٹ پر 3 دن تک انتظار کرتا رہا۔ پرویز مشرف نے اس وقت کے وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی کو کہا کہ وہ کابینہ سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کو امریکہ کے حوالے کرنے کی اجازت لے لیں۔ جمالی صاحب نے سختی سے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "Over my dead body" یعنی ایسا کرنے کے لیے ان کی لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔ اس طرح پرویز مشرف کے مذموم عزائم ناکام ہو گئے۔

جنرل مشرف نے میاں نواز شریف کی حکومت اپنے ہوسِ اقتدار کے لیے ختم کی۔ 2002ء کے الیکشن میں بے پناہ دھاندلی کی سرپرستی کی گئی۔ سنا ہے کہ انتخابی امیدواروں کی دو فہرستیں بنائی گئی تھیں۔ ایک فہرست مشرف کے دوستوں یعنی چوہدری برادران کے دوستوں کی تھی جن کو انتخابات میں جتوایا گیا۔ دوسری فہرست چودھری برادران کے ناپسندیدہ لوگوں کی تھی۔ ان لوگوں کو مشرف کے دشمن قرار دے کر انتخابات میں شکست دلوائی گئی۔

جنرل پرویز مشرف نے ہر قسم کی کرپشن، یعنی مالی، انٹلیکچوئل اور اخلاقی کرپشن کے دروازے کھول دیئے۔

اختتامیہ

ایک پیشہ کا اختتام اور دوسرے کا آغاز

سیاست

میں نے ایک مرتبہ صدر ضیاالحق سے کہا کہ مجھے وزیر خارجہ پاکستان تعینات کیا جائے۔ انہوں نے کہا وہ مجھے وزیر خارجہ بنانے کے لیے تیار ہیں لیکن تب جب میں قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہو جاؤں۔ ضیاالحق نے کہا کہ میرے ایم این اے بننے میں ان کی پوری مدد شامل ہوگی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بون میں مدت پوری ہوتے ہی میں خارجہ سروس سے قبل از وقت ریٹائر ہو جاؤں گا۔

اکتوبر/نومبر 1987ء میں نے بون سے واپسی پر میں نے وزیر اعظم کے نام خط میں 25 سالہ مدتِ ملازمت پوری ہونے پر مکمل پنشن کے ساتھ ریٹائرمنٹ کی درخواست کی۔ میں نے اجازت لینے کی غرض سے وہ خط ضیاالحق کو دکھایا۔ ضابطہ کے مطابق ریٹائرمنٹ سے تین مہینے پہلے درخواست دینا ہوتی ہے۔ دفتر خارجہ نے مجھ سے پوچھا کہ ریٹائرمنٹ کی تاریخ کون سی مقرر کی جائے۔ میں نے جواب دیا کہ اسی دن سے جس روز میں نے ریٹائرمنٹ کے لیے درخواست دی تھی۔

بدقسمتی سے 17 اگست 1988ء کو طیارہ حادثہ میں ضیاالحق کا انتقال ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں ملک کا سیاسی منظر نامہ یکسر بدل گیا۔ سیکریٹری دفاع اجلال حیدر زیدی نے مجھے اپنے دفتر بلا کر بتایا کہ سی 130 حادثہ سوچی سمجھی سازش تھا۔ طیارے کے ملبے سے دھماکہ خیز کیمیائی مواد برآمد ہوا تھا۔

بون سے واپسی پر مجھے دفتر خارجہ میں ایڈیشنل سیکریٹری خارجہ برائے مشرقِ وسطیٰ لگا دیا گیا۔ یہ عہدہ زیادہ دیر تک نہ رہا کیوں کہ میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ اور سیاست میں شمولیت کا فیصلہ کر چکا تھا۔ آئین کے مطابق سرکاری ملازمین صوبائی و قومی اسمبلی کے انتخابات میں نوکری چھوڑنے کے بعد دو سال تک حصہ نہیں لے سکتے۔ اکتوبر 1987ء میں واضح ہو گیا کہ عام انتخابات 1990ء میں ہوں گے۔ اڑھائی سال کے اس عرصہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے جلد از جلد نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

جونیجو نے سعودی عرب کے سرکاری دورہ پر جانا تھا اور میں ان کے وفد کا حصہ تھا۔ متعدد افراد بشمول وفاقی سیکریٹری اور قریبی دوست جاوید اختر میری ریٹائرمنٹ کا سن کر حیران رہ گئے۔ میں نے 60 سال کی عمر تک پہنچنے سے بہت عرصہ پہلے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔

دفتر خارجہ میں چند ہفتے ہی گزارے۔ مجھے اس افسوس ناک حقیقت کا ادراک بھی ہوا کہ کوئی شخص اتنا غیر مخلص اور غیر شائستہ بھی ہو سکتا ہے۔ ضیاالحق نے وفاقی سیکریٹری عبدالستار کو متعدد مواقع پر نوازا۔ ایک بار عبدالستار ٹینس کھیلتے ہوئے گر گئے اور ہسپتال داخل ہوئے۔ ضیاالحق ان کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے۔

جونیجو بھی بہت فائدے حاصل کر چکے تھے مگر وہ بھی ضیاالحق کے خلاف ہو گئے۔ اس صورتِ حال میں وزیرِ مملکت برائے خارجہ امور زین نورانی اور سیکریٹری خارجہ ستار نے انتہائی منفی کردار ادا کرتے ہوئے صدر اور وزیراعظم میں اختلافات کو ہوا دی۔ زین نورانی مختلف محفلوں میں ضیاالحق کی نقل اتارتے اور مذاق اڑاتے۔ ستار نے جونیجو کی خوشنودی کے لیے ضیاالحق کے احکامات ماننے سے انکار کرنا شروع کر دیا۔

عبدالستار ایک نالائق سازشی تھا۔

بون سے واپسی کے پہلے روز ہی دفتر خارجہ میں ستار نے ایڈیشنل فارن سیکریٹریوں کے سامنے یہ نقطہ اٹھایا کہ اسلام آباد میں غیر ملکی سفراء کو بتایا جائے کہ چیف ایگزیکٹو، صدر نہیں بلکہ وزیر اعظم جونیجو ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دفتر خارجہ کے معاملات کی اطلاع صدر کو نہ دی جائے۔ ستار اور نورانی کا میرے ساتھ رویہ بھی نامعقول تھا۔ صاحبزادہ یعقوب علی خان نے جمشید مارکر کو واشنگٹن ڈی سی میں سفیر تعینات کرانے میں اہم کردار ادا کیا جس کے وہ مستحق بھی تھے۔ ایک روز میری دفتر موجودگی میں ستار نے مارکر اور صاحبزادہ کو گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ صاحبزادہ نے مہنگے تحائف کے بدلے مارکر کو واشنگٹن ڈی سی تعینات کرایا۔ ستار، واشنگٹن ڈی سی میں تعیناتی کے لیے تڑپ رہا تھا اور اس نے یہ تاثر بھی دیا کہ اسے تعیناتی کے احکامات موصول ہو چکے ہیں۔ میں نے ضیاالحق سے اس بات کا ذکر کیا جس پر انہوں نے کہا کہ وہ کبھی واشنگٹن ڈی سی تعینات نہیں ہوگا۔ عین ممکن ہے ضیا پہلے سے جونیجو کو چلتا کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ جونیجو، زین نورانی اور ستار کے پاس اتنا اختیار نہیں تھا کہ وہ ضیاالحق کو گزند پہنچا سکیں تو انہوں نے اپنا غصہ مجھ پر نکالنا شروع کر دیا۔ وزیر اعظم اور صدر میں بڑھتی خلیج کا ادراک کرتے ہوئے ستار میں اپنا عہدہ خطرے میں ڈالنے کا حوصلہ نہ تھا۔ خارجہ خدمات میں تین دہائیاں گزارنے کے باوجود ستار شائستہ رویے سے نابلد ہی تھا۔

جونیجو کو ہٹانے اور قومی اسمبلی تحلیل کرنے کے بعد ضیاالحق نے ستار کو معطل کرنے کے آرڈر دے دیئے۔ اس موقع پر صاحبزادہ، مارکر اور سیکریٹری خارجہ ہمایوں خان کی مداخلت پر ضیاالحق نے ستار کو معاف کر دیا اور نوکری پر رہنے دیا۔ جونیجو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس نے مارشل لاء اٹھوادیا، دراصل حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک خالی بالٹی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

زین نورانی خارجہ پالیسی سے بے خبر تھے۔ وہ ضروری معاملات کا حل بھی تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ عبدالستار ایک بابو تھا اور اپنی انگلش کو بار بار لکھ کر خوش ہوتا تھا۔

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
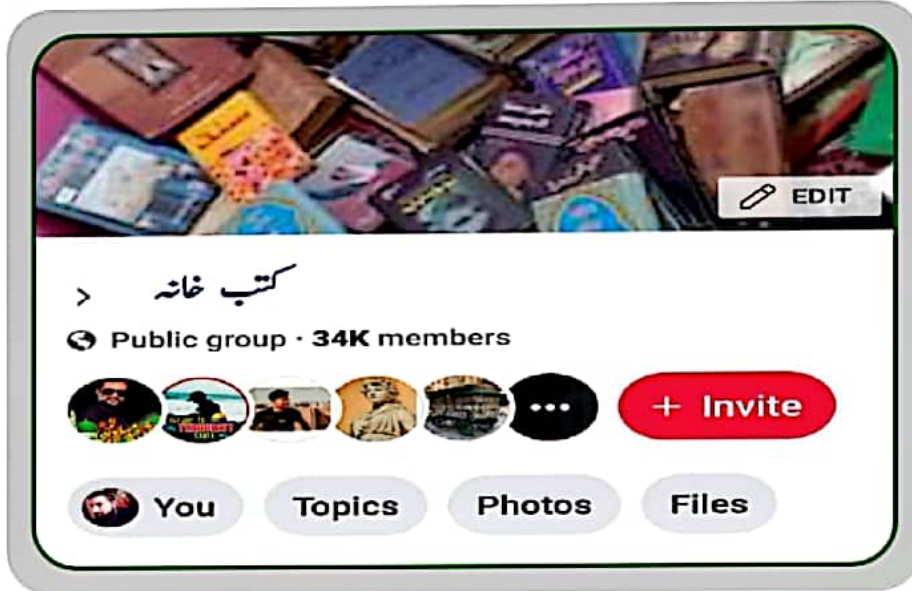
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

ضیا، جنیوا ایگریمنٹ سائن کرنے کے حق میں نہیں تھے کیوں کہ سوویت یونین شکست کھا کر افغانستان سے واپس جارہی تھی۔ جونیجو کا خیال تھا کہ وہ افغانستان پر ڈرامائی کام کرنے سے شہرت حاصل کریں گے۔ جنیوا معاہدہ پر دستخط کرنے کی وجہ سے پاکستان اور افغانستان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

جسٹس (ر) غوث علی شاہ جو کہ جونیجو کی کابینہ کے ایجوکیشن منسٹر تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جونیجو کو تجویز دی تھی کہ ضیاالحق کی مخالفت نہ کرے۔ غوث علی شاہ نے جونیجو سے کہا کہ تم بھٹو نہیں اور ضیا، فضل الٰہی چودھری نہیں۔

ضیاالحق دَور کے 11 سال

ضیاالحق سچے مسلمان اور سپاہی تھے۔ خدا پر اُن کا ایمان بہت مضبوط تھا۔ مشکل صورتِ حال میں وہ کہتے تھے کہ خدا مشکل کشا ہے۔ افغان جنگ کے باوجود ان کے دَورِ حکومت میں پاکستان پُر امن رہا۔ ان پر کلاشنکوف کلچر متعارف کرانے کا الزام غلط ہے۔ کلاشنکوف کے لائسنس دینے کا آغاز جونیجو نے کیا تھا۔ یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ بینظیر کے دورِ حکومت میں کلاشنکوف کا لائسنس 20 ہزار روپے کے عوض ملتا تھا۔ یہ خبر بھی ہے کہ غلام اسحاق خان کے ہاتھوں بینظیر کی حکومت کے خاتمے پر ایک اعلیٰ شخصیت سے 20 ہزار کلاشنکوف لائسنس پکڑے گئے۔

ضیاالحق ایماندار اور عاجزی پسند تھے۔ ان کی وفات کے بعد چند لوگوں نے الزام عائد کیا کہ انہوں نے خوب دولت سمیٹ رکھی تھی۔ 1989ء میں راولپنڈی میں عوامی اجتماع کے دوران اعجاز الحق نے کہا تھا کہ ہاں ضیاالحق کے پاس جنت میں بیش بہا خزانہ ہے۔ جس میں وہاں جانے کی ہمت ہے اسے وہ خزانہ مل جائے گا۔

ضیاالحق نے بھارت سے آزادی کی تحریک میں سکھوں سے تعاون کیا جس کے باعث پاکستان خصوصاً کشمیر میں بھارتی دباؤ کم ہوا۔ الزام لگایا جاتا ہے کہ بینظیر کے دورِ حکومت میں ایک اعلیٰ شخصیت نے بھارت کو علیحدگی کی تحریک میں حصہ لینے والے

سکھوں کے نام دیئے۔ بھارتی حکومت ان سکھوں کو قابو کرنے میں کامیاب ہوگئی اور خالصتان تحریک ناکام رہی۔ اس کے بعد بھارت کو آزادی مل گئی اور اس نے کشمیر میں آزادی کی تحریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ ضیاالحق کے تعاون کو سکھ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ضیاالحق کا 11 سالہ دَورِ اقتدار امن اور خوش حالی کا دَور تھا۔ عوام خوش تھے کہ روزمرہ کی ضروریات ارزاں نرخوں میں دستیاب تھیں۔

ضیاالحق دُور اندیش، جرأت و حوصلہ مند تھے۔ وہ بہترین ڈپلومیٹ اور قائد تھے۔ جب افغان جنگ کے دوران پاکستان کئی گنا طاقتور سوویت یونین سے نبرد آزما تھا، تب بھی ضیاالحق نے بھارت کو پاکستان پر حملہ کرنے کی سوچ سے دُور رکھا۔ افغان بھی ان کی بہت قدر کرتے ہیں۔

مجھے بلوچ قائدین بالخصوص بگٹی قبیلہ نے بتایا کہ پاکستان کی تاریخ میں صرف ضیاالحق نے بلوچوں سے مہذبانہ سلوک کیا۔ بھٹو نے جن بلوچ قائدین کو جیلوں میں قید کر رکھا تھا، ضیاالحق نے انہیں آزاد کر دیا۔ ضیاالحق نے مجھے خود بتایا کہ جب انہوں نے حکومت سنبھالی تو کوئٹہ کے لوگوں نے اسے کہا کہ اگرچہ گیس بلوچستان سے نکالی جاتی ہے مگر بلوچ اس سے محروم ہیں۔ کوئٹہ میں سوئی گیس کی سپلائی نہ تھی۔ ضیاالحق نے سوئی گیس اتھارٹی سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے۔ جواب ملا کہ کوئٹہ میں گیس سپلائی کرنا اقتصادی طور پر غیر منافع بخش ہے۔ ضیاالحق نے کہا کہ جن علاقوں سے گیس نکلتی ہے ان کو آپ کیسے محروم رکھ سکتے ہیں۔ ضیاالحق کے حکم پر فوراً بلوچستان گیس فراہم کی گئی۔

اگرچہ بھٹو نے پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کا آغاز کیا، لیکن ضیاالحق نے ایٹم بم کی تکمیل یقینی بنائی جس کے نتیجے میں پاکستان بھارتی دھونس اور ممکنہ جارحیت سے محفوظ ہو گیا۔

اہم تاریخی دستاویز

سحر ہونے تک

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

یہ اہم کتاب جو تاریخی اہمیت کی حامل ہے، وہ ہے میاں عبدالوحید کی آپ بیتی "Before Memory Fades" یعنی ''قبل اس کے کہ یادداشت جواب دے جائے''۔ اس کے ٹائٹل میں آپ نے لکھا ہے "Emergence of Pakistan as a Nuclear Power" ۔اس طرح ملک کی تاریخ کے ایک معجزے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ میاں عبدالوحید، سابق آرمی چیف و صدر جنرل ضیاالحق کے فرسٹ کزن ہیں۔ یعنی ان دونوں کے والدین سگے بہن بھائی تھے۔ میاں صاحب کے سسر بٹالہ کے مشہور صنعت کار جناب سی ایم لطیف، بٹالہ انجینئرنگ کمپنی BECO کے مالک تھے جو غیر منقسم ہندوستان میں ایک اعلیٰ درجہ کی فیکٹری تھی۔ توقعات اور امیدوں کے خلاف اور ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کی غداری کی وجہ سے یہ علاقہ آخری لمحوں میں ہندوستان کو دے دیا گیا تھا۔ انہوں نے پاکستان ہجرت کر کے لاہور میں PECO یعنی پاکستان انجینئرنگ کمپنی کے نام سے نئی فیکٹری قائم اور اعلیٰ مشینیں بنانے لگے۔ جب 1976ء میں، میں نے کہوٹہ کی بنیاد رکھی تو ہم نے ان سے لاتعداد مشینیں خریدیں جن سے اہم کام لیا گیا تھا۔ میاں وحید سفارت کار ہیں، پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے

اکنامکس اور امریکہ کے مشہور فلیچر سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی اور ہارورڈ سے تعلیم حاصل کی ہے۔ شروع میں پولیس سروس میں ملازمت کی۔ صوبہ سرحد میں ڈی آئی جی رہے، بعد میں سفارتی زندگی کا آغاز کیا اور 27 برس کی مدت کے دوران دنیا کے بہت سے ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ آپ کی اہم تعیناتیاں بطور سفیر جرمنی اور اٹلی میں تھیں۔ آپ نے وزارتِ خارجہ سے استعفیٰ دے کر الیکشن میں حصہ لیا تھا اور 1990ء اور 1997ء میں قومی اسمبلی میں نمائندگی کی تھی۔ آپ 1997ء میں قومی اسمبلی کی اسٹینڈنگ کمیٹی برائے خارجہ امور کے چیئرمین بھی رہے ہیں۔

میاں وحید کی جرمنی میں تعیناتی پہلے 1977ء سے 1981ء تک اور پھر 1984ء سے 1987ء کا وقت ہمارے لیے، خاص طور پر ہمارے نیوکلیئر پروگرام کے لیے بہت اہم تھا۔ جب بھٹو صاحب نے یورینیم کی افزودگی (اور ایٹمی ہتھیاروں کا) پروگرام 1976ء میں میرے حوالہ کیا تو اس وقت بلجیم میں اور بعد میں پیرس میں منیر احمد خان کا نہایت معتمد اور دست راست اور پرانا ساتھی شفیق احمد بٹ وہاں پروکیورمنٹ افسر تھا، یہ ضرورت سے زیادہ ہی منیر کے وفادار تھے اور وجوہات میں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے فوراً اپنا افسر بھیجنا تھا۔ میری درخواست پر POF کے چیئرمین جنرل علی نواب نے، جو ایک نہایت قابل انجینئر اور فرشتہ خصلت انسان تھے، اپنا ایک نہایت اچھا، جرمن زبان بولنے والا اور جرمنی میں پہلے کام کرنے والا افسر انجینئر اکرام الحق مجھے دے دیا اور میں نے ان کو بون میں پوسٹ کر دیا۔ ان کے میاں وحید سے بہترین تعلقات تھے۔ پہلے یہ قونصلر تھے اور بعد میں کمرشل منسٹر بنے اور انہوں نے طویل عرصہ تک بہترین، مفید خدمات انجام دیں۔ میاں وحید نے ہمیشہ ان کی مدد کی جو ہمارے پروگرام کی تکمیل کے لیے اہم ثابت ہوئی۔

میاں عبدالوحید کی اس اہم کتاب کی اشاعت جمہوری پبلی کیشنز، 2-ایوان تجارت روڈ، لاہور 042-36314140 نے کی ہے۔ یوں تو پوری کتاب ہی نہایت دلچسپ تاریخی واقعات سے پُر ہے لیکن میں خاص طور پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر لکھے گئے باب پر تبصرہ کروں گا کیوں کہ میں خود ان حقائق سے پوری طرح واقف ہوں اور میاں

صاحب چوں کہ جنرل ضیاالحق کے فرسٹ کزن کی حیثیت سے ان سے باقاعدگی سے ملا کرتے تھے اور جنرل ضیا کو اعتماد میں لے کر ہمارے کام کی ترقی سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

میاں عبدالوحید نے اپنی کتاب کے 12-A باب میں پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں۔ ہندوستان کے 18 مئی 1974ء کے ایٹمی دھماکے کے بعد میں خاصا پریشان اور شش و پنج میں تھا اور آخرکار ستمبر 1974ء کو میں نے ہمارے سفیر، فرشتہ خصلت اور نہایت محب وطن جناب جے جی خراس کی معرفت بھٹو صاحب کو خط لکھا تھا کہ اگر پاکستان نے فوراً جوابی اقدامات نہیں کیے تو پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور یہ کہ میں اس سلسلے میں رہنمائی کر سکتا ہوں۔ میاں صاحب نے اس خط کی آمد اور بعد کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ میں پہلے دسمبر 1974ء میں بھٹو صاحب کی دعوت پر آیا اور پھر دسمبر 1975ء میں دوبارہ آیا تو انہوں نے روک لیا۔ ہمارا ارادہ رکنے کا قطعی نہ تھا مگر ان کے اصرار پر رک گئے۔

میں کوئی ڈرائنگ یا معلومات نہ لایا تھا، سب کچھ دماغ میں تھا اور تجربہ میرا اثاثہ تھا۔ چند ماہ بعد پروجیکٹ کو اٹامک انرجی سے علیحدہ کر کے میرے حوالے کر دیا گیا کیوں کہ اس کی نگرانی میں یہ ناممکن تھا۔ ہم نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا اور نہ صرف یورینیم کو بم کے لیے افزودہ کیا بلکہ جنرل ضیا کی ہدایت پر ایٹم بم بھی بنا دیا اور ان کو 10 دسمبر 1984ء کو تحریری طور پر آگاہ کر دیا کہ ہم ایک ہفتہ کے نوٹس پر ایٹمی دھماکہ کر سکتے ہیں۔ میاں عبدالوحید نے اس خط کی آمد پر جنرل ضیا کی خوشی کے اظہار کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی تصدیق کی ہے کہ کس طرح منیر احمد خان اور اس کے حواری ہمارے خلاف کام کر رہے تھے اور کس طرح DG-MO کے پاس سیف میں رکھوائی گئی ایٹم بم کی ڈرائنگ اور تفصیلات وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل خالد محمود عارف نے نکلوا کر منیر احمد خان کو دے دی تھیں تاکہ اس کے حواری اس کی نقل کر کے ایٹم بم بنانے کے دعوے دار بن جائیں۔ جنرل ضیا نے جنرل عارف کی اس سازش کا ذکر میاں وحید سے کیا تھا اور سخت اظہار برہمی کیا تھا۔ میاں وحید نے ویانا میں سفارت خانے کے سٹاف کے خلاف بھی منیر

احمد خان کی سازشوں کا تذکرہ کیا ہے۔

ان تمام حقائق کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس ملک میں ذاتی مفاد، خاندانی دوستی، برادری کے تعلقات قومی مفادات پر فوقیت رکھتے ہیں اور لوگ ملکی مفاد کو نقصان پہنچانے کی خاطر کسی بھی غیر اخلاقی اور قابل مذمت حرکت کرنے سے باز نہیں آتے۔

میاں وحید کی یہ کتاب خزینہ معلومات ہے۔

(روزنامہ جنگ 15 اپریل 2013ء)
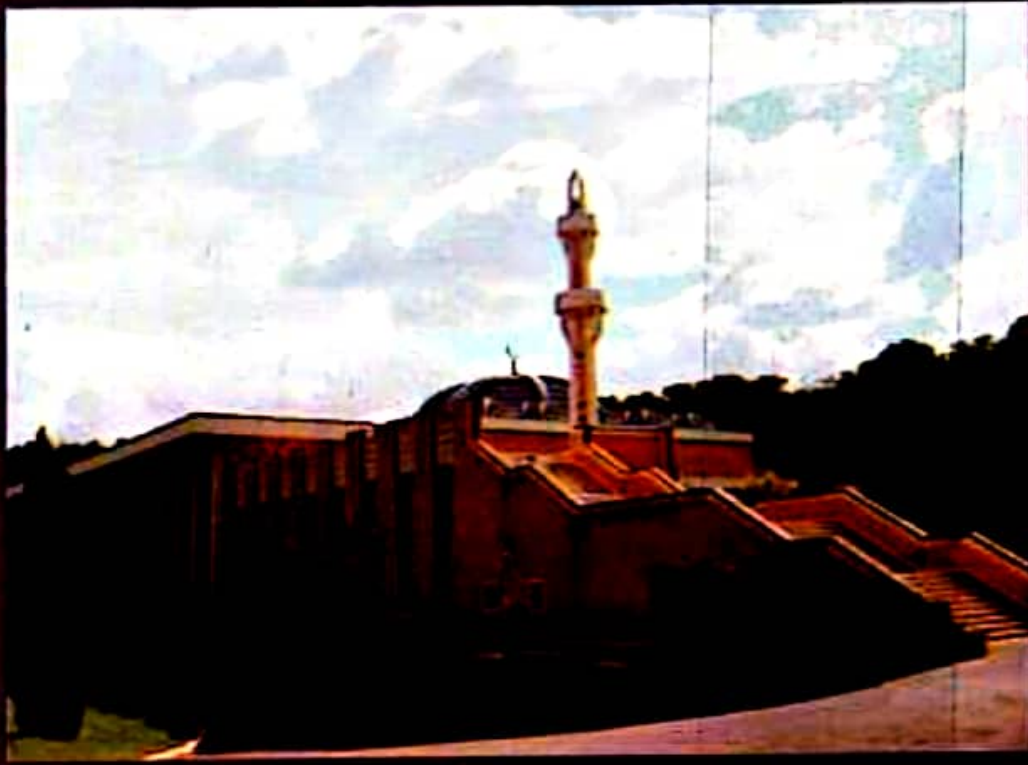
اٹلی میں اسلامی کلچرل سینٹر
میاں عبدالوحید
ایم اے اکنامکس، پنجاب یونیورسٹی
ایم اے انٹرنیشنل لاء، فلیچر سکول آف لاء اینڈ ڈپلومیسی، ہاورڈ یونیورسٹی، یو ایس اے
اٹلی میں سفیر 1981-1984ء
جرمنی میں سفیر 1984-1987ء
1990، 1993، اور 1997ء میں پاکستان قومی اسمبلی کے منتخب رکن
منتخب چیئر مین سٹینڈنگ کمیٹی برائے خارجہ امور، پاکستان قومی اسمبلی، 1997ء
ISBN 978-969-9739-49-1
9 789699 739491
جمہوری
JUMHOORI